

اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

تندیلِ ادب

مدیر رانا عبدالرزاق خاں

rana_razzaq@hotmail.com

فون نمبرز۔ 02089449385 07886304637

معاون مدیر و ڈپرائیز ائٹر

عاصمہ امیر۔ 07903126126

majeedamer20@yahoo.com

نگران ویب سائٹ، ایاز را ٹھوڑ

www.bazmesherosukhan.co.uk

سوہن راہی۔۔۔۔۔	سالی نومبار کرسٹ ۲۰۱۳ء
عبد الجلیل عباد۔۔۔۔۔	غزل
ارشاد عرشی ملک۔۔۔۔۔	دعا برائے لذت و حلاوت در نماز
رانا عبدالرزاق خاں۔۔۔۔۔	اُردو زبان کے ادوار اور فضیلت
جون ایلیا کی نظر میں۔۔۔۔۔	عبداللہ علیم کی شاعری
سید احمد دہلوی۔۔۔۔۔	کا (تعریت نامہ) حضور ملکہ معظمه قیصرہ ہند
رانا عبدالرزاق خاں۔۔۔۔۔	اُردو زبان کی ابتدا صوفی غلام مصطفیٰ بتسم کی نظر میں
اے آر راجپوت۔۔۔۔۔	اسلام کے ذریں اصول
سلمان غازی۔۔۔۔۔	مظلوموں کے نام
عاصی صحرائی۔۔۔۔۔	ترقی پسند تحریک مصنفوں سے وابستہ چند تحقیق کار

وضاحت۔ قندیلِ ادب انٹرنشنل کی سیاسی سماجی مذہبی گروہ یا فرقے کا ترجمان نہیں یہ نسل یا فرقوں کے انتیاز سے بالاتر ہے یہ صرف اردو ادب کی ترقی و ترویج کے لئے جاری کیا گیا ہے اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا تتفق ہونا ضروری نہیں قارئین کو آراء یا مضاہمین سے اختلاف کا حق حاصل ہے اور اس کے صفات حاضر ہیں۔ تحریر کے ساتھ اپنا تکملہ ایڈریஸ اور فون نمبر ضرور ارسال کریں یہ آپ کا اپنا میگزین ہے۔

گزارش

قدیلی ادب کے قارئین کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس ماہنامے کو ہر اعتبار سے معیاری، دیدہ زیب، منفرد، معتبر بنانے کی کوشش مسلسل شب دروز جاری ہے براۓ مہربانی اس سلسلہ میں اپنی گروں قدر آراء اور مشوروں سے نوازتے رہیں۔

علمی امن و آشتی اور علم و ادب کی ترویج کے لئے مضامین بھیجتے رہیے۔ ماہنامہ قندیل ادب اشاعت کے سلسلے میں تن تھا اقبال و خیزان بے یار و مددگار متعدد مالی دشواریوں کے باوجود خدمت اردو ادب میں ایک سال سے مصروف عمل ہے۔ اور اب اسے پر عالم میڈیا میں لانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اگر شاکرین اس میں وچکی لیں تو یہ کام ذرا آسان ہو جائے گا جس کے لئے پانچ صد روپیہ ادا کار جسٹر ڈھونا ضروری ہے۔ برطانیہ کے لئے قندیل ادب کا ماہنہ چندہ ایک پونڈ اگر کوئی ایک سال کی فیس ایڈو انس جمع کروائے تو اس کی فیس بارہ برطانوی پونڈ ہو گئے۔ اس روپیہ کے لئے آپ کو مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں رقم ارسال کرنی ہوگی۔

ABDULRAZZAQ KHAN BANK NAME HSBC

A/C 04726979—SORT CODE 40-05-00

دیگر مالک کا سالانہ چندہ ڈاک خرچ کے علاوہ ہو گا۔ درجہ اسی میل کر دیا جایا کرے گا اور دیب سائس پر بھی مہیا ہو گا۔ امید و سوت احباب ادارہ قندیل ادب سے تعاون فرمائیں گے۔ آپ کی محبت، تعاون کا بندہ منتظر ہے گا۔ نیز اپنی آراء اور مضامین ضرور بھیجتے رہیے۔ آپ کا اپنا میگزین ہے۔ اس کی ترقی میں آپ کا تعاون درکار ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

قندیلِ ادب انٹرنشنل لندن فروری ۲۰۱۳ء

شمارہ نمبر ۱۳

محل معاورت

بیشراحمد رفیق لندن، آدم چختائی برمنگھم، مبارک صدیقی لندن، زکریا اور کنیڈا، تنویر احمد آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بھرین

☆☆☆

وضاحت۔ گزارش۔ آپ کے خطوط

حمد فراز۔۔۔۔۔	غزل
عبداللہ علیم۔۔۔۔۔	غزل
محسن احسان۔۔۔۔۔	غزل
شہزاد احمد۔۔۔۔۔	غزل
ساغر صدیقی۔۔۔۔۔	غزل
امجد اسلام امجد۔۔۔۔۔	غزل
امجد مرزا امجد۔۔۔۔۔	غزل
اقبال ساجد۔۔۔۔۔	غزل
شہریار۔۔۔۔۔	غزل
بیشرا بدرا۔۔۔۔۔	غزل
آدم چختائی۔۔۔۔۔	غزل
مبارک صدیقی۔۔۔۔۔	غزل
ارشاد عرشی ملک۔۔۔۔۔	تھہ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
راجہ غالب احمد۔۔۔۔۔	غزل
فرید احمد ناصر۔۔۔۔۔	غزل
انور ندیم علوی۔۔۔۔۔	غزل
اہن کریم۔۔۔۔۔	غزل
حبیب جالب۔۔۔۔۔	غزل
عاصی صحرائی۔۔۔۔۔	غزل
مرسلہ بی اے رفیق۔۔۔۔۔	آنکھیں
اسحاق ساجد۔۔۔۔۔	غزل
منور احمد کنڈتے۔۔۔۔۔	غزل

بھڑکا!

دنیانہ کرے پیار، کرے پیار، مجھے کیا؟
 جب تم نہ رہے یار، مرے یار، مجھے کیا؟
 اے تیر نظر آزما اس دل کی فراخی
 اب ٹوڑ ہے اس پار یا اس پار مجھے کیا؟
 میں تنگی سے کھیل کے نکلا ہوں، پر ہکٹ!
 اے موت! مجھے چھوڑ، مجھے مار، مجھے کیا؟
 وہ جس نے کبھی اپنے قبیلے کو نہ پوچھا
 اب آ گیا سردار سردار مجھے کیا؟
 خود مجھ کو محبت کے عقیدے پہ لگا کر
 اب روئے ہیں مجھ کو مرے یار مجھے کیا؟
 انعام میں جب وہ نہیں تو کھیل کیا کھیلیں؟
 اے دل! ہوتیری جیت، تری ہار، مجھے کیا؟

عامر امیر

شب کے رُخار سے ڈھلک کر دیکھوں
ان کے قدموں تلے فلک اور میں دیکھوں
صرف پہنائی فلک
محسن احسان

صوفی شہر مرے حق میں دعا کیا کرتا
خود تھا محتاجِ عطا مجھ کو عطا کیا کرتا
اپنی آواز کے سنائے سے ہول آتا تھا
میں بیانِ تمدن سے صدا کیا کرتا
سنس لیتے ہوئے سینے میں جلن ہوتی ہے
میں ترے شہر کی شادابِ فضا کیا کرتا
مُحَتَّبِ جرمِ مرا دیکھ کے خاموش رہا
خود خطا کا تھا، حکامِ سزا کیا کرتا
اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
میں یہاں جرأت پرواز بھلا کیا کرتا
میں لٹا کر بھی متاعِ دل و دیدِ خوش ہوں
ننجھ سے رہبرِ گلہ مہرووفا کیا کرتا
رفعتِ دار بھی محو لی تیری خاطر میں نے
منکرِ عہدِ وفا! اور بتا کیا کرتا
تم نے چھین لی مجھ سے مری گویائی بھی
میں تو اک کاغذِ آتش زده تھا، کیا کرتا
اب نہ وہ کشت ہی باقی ہے نہ وہ حاصلِ کشت
اور اس دل کا زیان سیل بلا کیا کرتا
خود فرموشی کے صحراؤں میں گم تھا محسن
کوئی اس بے خبر جاں سے گلہ کیا کرتا

شہزاد احمد

نہ سہی کچھ مگر اتنا تو کیا کرتے تھے
وہ مجھے دیکھ کے پچان لیا کرتے تھے
آخر کار ہوئے تیری رضا کے پابند
ہم کہ ہر بات پر اصرار کیا کرتے تھے
میں تجھے اپنی جاں تلک دیکھوں
بند کیوں ذات میں رہوں اپنی دیکھوں
موج بن جاؤ اور چھلک دیکھوں
صح میں دیر ہے تو پھر اک بار

آپ کے خطوط
ساجد رانا لندن سے رقم طراز ہیں۔ قدمیل ادب جنوری ۲۰۱۳ء، بہت خوب صورت اور
دیدہ زیب ہے۔ کیا خوب آپ کی سلیکشن ہے۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ خدا تعالیٰ آپ
کی کاوشوں میں مزید برکت دے۔ دیارِ مغرب میں کیا ہی خوبصورت قدمیل ادب
آپ نے روشن کی ہے۔

احمد فراز

گرفتہ دل عندیب گھائل گلب دیکھے
محبتوں نے سبھی رُتوں میں عذاب دیکھے
وہ دن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں
یہ شہر اک روز پھر سے یومِ حساب دیکھے
یہ صحیح کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے
وہ چشمِ محروم کتنی محروم ہے کہ جس نے
نہ خواب دیکھے نہ رت جگوں کے عذاب دیکھے
کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پر آبلے ہیں
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے
عجائب نہیں ہے جو خوبیوں سے ہے شہرِ خالی
کہ میں نے دہنیز قاتلاں پر گلب دیکھے
یہ ساعتِ دید اور وحشت بڑھا گئی ہے
کہ جیسے کوئی جنوں زدہ ماہتاب دیکھے
مجھے تو مکتبی کے دن یاد آگئے ہیں
کہ میں اسے پڑھ رہا ہوں اور وہ کتاب دیکھے

عبداللہ علیم

خواب ہی خواب کب تلک دیکھوں
کاشِ شجھ کو بھی اک جھلک دیکھوں
چاندنی کا سماں تھا اور ہم تم دیکھوں
اب ستارے پلک پلک دیکھوں
جانے تو کس کا ہم سفر ہوگا
میں تجھے اپنی جاں تلک دیکھوں
بند کیوں ذات میں رہوں اپنی دیکھوں
موج بن جاؤ اور چھلک دیکھوں
صح میں دیر ہے تو پھر اک بار

لوگ پتھر کو خدا مان لیا کرتے تھے شہر پر چھائی ہوئی سرخ گھٹا ہے کب سے
دوستو! اب مجھے گردن زدنی کہتے ہو چاند بھی میری طرح خُسن شاسا لکلا
تم وہی ہو کہ مرے رُخ سیا کرتے تھے اس کی دیوار پر حیران کھڑا ہے کب سے
ظلم کرتے ہو مگر اُف نہیں کرنے دیتے تم سے اچھے کہ وہ ترپنے تو دیا کرتے تھے
ہم جو دستک کبھی دیتے تھے صبا کی مانند آپ دروازہ دل کھول دیا کرتے تھے
اب تو شہزاد ستاروں پر گلی ہیں نظریں کبھی ہم لوگ بھی مٹی سے جیا کرتے تھے

امجد مرزا الجد

میرا تو عشق موج روائی ہو گیا
میں آج خود ہی اپنا تماشائی ہو گیا
اُبھری جو تیری شکل تو یہ دل کا آئینہ
ٹوٹا کچھ اس طرح تیری انگرائی ہو گیا
دیکھا تجھے عزیز رکھا اور کھو دیا
ٹھہرا جو وقت درد کی شہنائی ہو گیا
تو آیا میں نہ تھا ، میں گیا ٹو نہیں ملا
ایسے میں کون تھا کہ جو ہرجائی ہو گیا
ٹو اک گلی کے موڑ پر گم ہو گیا تھا کل
اجد تو اس گلی کا ہی سودائی ہو گیا

اقبال ساجد

غار سے سگ ہٹایا تو وہ خالی لکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی لکلا
چڑھتے سورج نے ہر ہاتھ میں سکھوں دیا
صح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوائی لکلا
سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرصاء فال مرے نام پر گالی لکلا
راس آئے مجھے مر جھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا بہ تو مرے چہرے کی بحالی لکلا
مُنْظَرِ کوئی سر کوہ ندا ہے کب سے
گور چشوں کے لئے آئینہ خانہ ، معلوم!
ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے میرا
وکھیے خون کی برسات کہاں ہوتی ہے رات جب گزری تو پھر صح حتا رنگ ہوئی

ہے دُعا مگر حرف دُعا یاد نہیں
میرے نغمات کو انداز نوا یاد نہیں
ہم نے جن کی راہوں میں پھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں
زندگی جو جو مسلسل کی طرح کائی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے دریا پر دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جیکوئی صدا یاد نہیں
کیسے بھر آئیں سر شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرائی ستاروں کی ضیا یاد نہیں
صرف ڈھنڈلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا کون ہوا مجھ سے خفا یاد نہیں
آؤ اک سجده کریں عالم مدھوشی میں
لوگ کہتے ہیں ساغر کو غدا یاد نہیں

امجد اسلام اجد

دامِ خوشبو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی اُبجھن میں پڑا ہے کب سے
اے کڑی پچ کے درو بام سجائے والے
منتظر کوئی سر کوہ ندا ہے کب سے
گور چشوں کے لئے آئینہ خانہ ، معلوم!
ورنہ ہر ذرہ ترا عکس نما ہے کب سے میرا
وکھیے خون کی برسات کہاں ہوتی ہے رات جب گزری تو پھر صح حتا رنگ ہوئی

آسمان جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا دھنک کی اوڑھنی لے کے چلے بادل فضاوں میں رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے دروازام بجے انہیں دیکھا تو مچلے رند یارو خوش اداوں میں چاند کی طرح مرا عکس خیالی نکلا ہوا گلزار جاناں سے چرا لائی ہے رنگین تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

شیرار
جنت جس کی تھی اُس کو تو نہ پایا ہم نے عبّت نے ہمیں رسوائیوں سے دور ہی رکھا وگرنہ سو ہی جاتے ہم تری زلفوں کی چھاؤں میں حیا کی شوخیوں نے حسن کو بخشی ضیا لیکن ہزاروں دھڑکنیں تو نے جگا دیں پارساوں میں یہ تیری ہی کریمی نے بھرا جام سخن ورنہ کہاں آتا خمار لفظ و معنی التجاویں میں وہ جس کے فیض سے پھوٹے ہیں آدم نور کے چشمے اُسی کی رحمتوں کے تو سمندر ہیں گھٹاؤں میں

مبارک صدیقی

آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں جس کو ملنے سے روح جگگانے لگے

دل دھڑکنے لگے گنگانے لگے
چشم ویراں پھر جھملانے لگے

اپنے ہاتھوں سے خوبیوں سی آنے لگے
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں

جس کے لمحے میں لذت ہے ایمان کی
جس کی باتوں میں خوبیوں ہے آذان کی

جس کا ہر پل شاء رب رحمان کی
جس کا ہر بول تفسیر قرآن کی

میں آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں
جو کہے بس جیو تو خدا کے لئے

ہر عمل ہو خدا کی رضا کے لئے
کہاں دن گزارا کہاں رات کی

وقف ہو جائیں سارے دعا کے لئے

آجائے بھر دیئے تو نے گلی تر کی قباوں میں جس کا دست دعا اک اعجاز ہے

آسمان جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا دھنک کی اوڑھنی لے کے چلے بادل فضاوں میں رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے دروازام بجے انہیں دیکھا تو مچلے رند یارو خوش اداوں میں چاند کی طرح مرا عکس خیالی نکلا ہوا گلزار جاناں سے چرا لائی ہے رنگین تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

جنتجو
جبتو جس کی تھی اُس کو تو نہ پایا ہم نے اس بہانے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے سب کا احوال وہی ہے جو ہمارا ہے آج یہ الگ بات کہ ٹکوہ کیا تھا ہم نے خود پیشان ہوئے، نے اُسے شرمدہ کیا عشق کی وضع کو کیا خوب بھایا ہم نے عمر بھر سچ ہی کہا، سچ کے سوا کچھ نہ کہا اجر کیا اس کا ملے گا، یہ نہ سوچا ہم نے کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

بیبری بلدر

نہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی بڑی آرزو تھی ملاقات کی

شب ہجر تک کو یہ تشویش ہے مسافر نے جانے کہاں رات کا

مقدار مری پشم پر آب کی برست رات کا

برستی ہوئی رات کی پریاں نہانے لگیں نجدی گنگانی خیالات کی

اجالوں کی ہوئی رات کی گئی گئی زبان سب سمجھتے ہیں جذبات کی

زبان کئی سال سے کچھ خبر ہی نہیں کہاں دن گزارا کہاں رات کی

آدم چھٹائی آجائے بھر دیئے تو نے گلی تر کی قباوں میں جس کا دست دعا اک اعجاز ہے

اب زمیں پہ جو خدا کی آواز ہے اس میلے میں پر دل نہ لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
جس کا دھیما سا اپنا ہی انداز ہے اشعار کا فن لفظوں کا بہر خود تو نے مجھ کو بخفا ہے
جسکو ملنا سعادت ہے اعزاز ہے اب کہتا ہے مت شرعاً تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں کم ظرف ہے پیغم فضلوں سے کچھ شوشی میں آجائی ہے
عُرقی کو زیادہ منہ نہ لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں

رجہ غالب احمد

کچھ دن ہم بھی اُداس رہے پھر صبح وہی پھر شام وہی
چکر پھر اُسی پیانے کا، پھر گردش میں ہے جام وہی
دوست وہی، دشمن بھی وہی، بیکوئے بھی وہی الزام وہی
اپنی دعائیں بھی ہیں وہی اور ہیں ان کے دشام وہی
میرے باغِ غم و آلام میں ایک سا موسم رہتا ہے
زرد گلاب سے دن بھی وہی ہیں، راتیں بھی گلگرام وہی
”میرے رب مظلوم ہوں میں اب ظلم و ستم کو پیں بھی ڈال“
نصرت تیری کب آئے گی ہو اس کا انجام وہی

فرید احمد ناصر

تیرے جمال کا قصہ مرے خیال میں تھا
سو لمحہ جو بھی تھا گزرا ترے وصال میں تھا
مرا سوال تو آگے تھا اعتدال سے بھی
ترا جواب مگر حدِ اعتدال میں تھا
ہر اک لفظ میں پہاں تھے مجرے تیرے
نہ جانے تیرا قلم کس کے استعمال میں تھا
ترے حروف تھے جادو، کمال تیرا کلام
بھی کمال تو پہاں ترے جمال میں تھا

انور ندیم علوی

قرآن کو دیں گے عزت، جو دل سے اور جاں سے
بے شک طے گی عزت ان کو بھی آسمان سے
ہے اُس کی ایسی لذت، پائے گا اک سکینت
پی لے کبھی جو تشنہ اس چشمہ رواں سے
اکمل بھی آخری بھی، عرفان کا سمندر
ہر حرفاً ہے صداقت، دیکھے گا تو جہاں سے

اہنِ کریم

صحرا میں پھول کھلائیں گے
انہوں کر دکلائیں گے
ہر آن مرے ہمراہ بھی ٹوپ پیارے بے پرواد بھی ٹو
کھونے کا تجھے دھڑکا ہے لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
دیا میں ٹو نے بیج دیا ہم آبھی گئے اور رہ بھی لئے ہم

بے ہنر، باخن بانہر ہو گئے ہو گئے
کتنے ابڑے ہوئے با شر ہو گئے
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں گو کہ عاشق ہزاروں کھڑے ہیں ادھر
پھرم تر ہم بھی جائیں گے اُس را گھر
ہم خطا کار ہیں جانتے ہیں مگر
اُس کی پڑ جائے ہم پہ بھی شائد نظر
آؤ اُس سے ملیں آؤ اُس سے ملیں

ارشاد عرشی ملک۔ تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں

یہ درد جو دل کو چید گیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
میں عبد ترا تو میرا خدا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
اک تو ہی محرم راز مرا، ہمدرد مرا، م ساز مرا
بندوں سے مجھے آتی ہے جیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
کچھ دن جو غرب میں گزرے ہیں وہ دن ہی مرا سرمایہ ہیں
ہر دن میں تھا اک لطف نیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
میں تجھ سے باتیں کرتی ہوں بنتی ہوں کبھی رو دیتی ہوں
کیا تو نے مرا حال کیا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
اب دنیا داری کی باتیں سنتے ہی نہیں ہیں کان مرے
آہٹ پر تری یہ دل آٹھا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
میں چلتے پھرتے سوتے جاتے تجھ سے باتیں کرتی ہوں
تو وہ کہتا ہے جا سر نہ کھا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
جس روز نہ تجھ سے مل پاؤں دل اکھڑا اکھڑا رہتا ہے
وہ دن ہے گیا یوم سزا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں

ہر آن مرے ہمراہ بھی ٹوپ پیارے بے پرواد بھی ٹو
کھونے کا تجھے دھڑکا ہے لگا تجھ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں
دیا میں ٹو نے بیج دیا ہم آبھی گئے اور رہ بھی لئے ہم

ہم	بیٹھے	بل	ہی	بولیں	گے اتنا ظلم، سلحہ بھی ہمارا اور لاشے بھی ہمارے ہو گئے
تینی	کی	بات	منائیں	گے اس قدر اسلام آباد کا بول و بالا ہو گا	
جہاں	ساایہ	گلن	ملائک	ہوں مظلوم بھی میری قوم اور غلام بھی ہمارے ہو گئے	
اُسے	شہر	دل	میں	گے اس قدر بگڑ جائے کی امت مسلمہ نعوذ باللہ	
یہ	نور	بھی	تو	دشت گرد، زانی، چور، سمجھی بے ایمان ہمارے ہو گئے	
خوشخبری	سب	ہی	پائیں	کہا ہے مرے آقا نے سور اور بندر ان کو	
ہم	نام	خدا	اور	جو بے عمل، فتوی پاز دینی سکالرز ہمارے ہو گئے	
سب	دنیا	تک	لے	سان و نسل کی اس قدر لگادی ہے آگ اس ملانے	
ایہ	جنگ	جدل	کا	مسجد و منبر، علماء سوء کیارادوں سے بٹوارے ہو گئے	
ہر	قوم	کو	یہ	مولوی اس قدر ہو جائے گا شاطرو چالاک	
ہم	صلح	مغل	اور	سب کرت، ڈاکو، جعلی، مذاہ اس کے سارے ہو گئے	
ہم	پیار	کے	دیپ	بے ریش بھی رکھیں گے باطنی داڑھی	
ہر	ذہن	خائب	و	مسجد و منبر سے غلط سب اشارے ہو گئے	
ہر	صورت	دیں	پھیلائیں	متعہ کے بہانے ہوگا عام زنا و شرب عناب	
ہم	حکیقی	خون	پھلتی	لگے گا سب کچھ نمیک مگر حمام میں ننگے سارے ہو گئے	
ہم	اس	کو	خون	آنکھیں۔۔۔۔۔ مرسلہ بی اے رفیق	
ہم	سیف	کی	ہوتی	جات	
ہم	قام	سے	چلائیں	کے	

حبيب جالب

اس دور کے رسم رواجوں سے، ان تختوں سے ان تاجوں سے جو ظلم کی کوکھ سے جنتے ہیں، انسانی خون سے پلتے ہیں جو نفرت کی بنیادیں ہیں، اور خونی کھیت کی کھادیں ہیں میں باغی ہوں میں باغی ہوں، جو چاہے مجھ پر ظلم کرو، مذہب کے جو بیوپاری ہیں، وہ سب سے بڑی بیماری ہیں وہ جن کے سوا سب کافر ہیں، جو دین کا حرف آخر ہیں ان جھوٹے اور مکاروں سے، مذہب کے تھیکیداروں سے میں باغی ہوں میں باغی ہوں، جو چاہے مجھ پر ظلم کرو میرے ہاتھ میں حق کا جھندا ہے، میرے سر پر ظلم کا پھندا ہے میں مرنے سے کب ڈرتا ہوں، میں موت کی خار زندہ ہوں میرے خون کا سورج پچکے گا، تو پچہ پچہ بولے گا، میں باغی ہوں میں باغی ہوں، جو چاہے مجھ پر ظلم کرو

عاصی صحرائی

میں نے سوچا تھا کہ سب چاند ستارے ہو گئے ایک پرچم کے تتلے سارے کے سارے ہو گئے جتنے مارے ہیں مسلمان مسلمانوں نے ساری دنیا نے تو مل کر بھی نہ مارے ہو گئے ساری راہوں کے یہ نہ معلوم تھا کہ مسلم کو کہہ گا مسلم کافر چاہیں اور آبلے کتنے

اسحاق ساجد

کتنے	ایک	منزل	ہے	راتے	کتنے
کتنے	جانے	پہنچیں	گے	راتے	کتنے
کتنے	بڑھ	گیا	اس کا	شوک خود	کتنے
کتنے	ہوں	گے	اب	پھر آئینے	کتنے
کتنے	اُس	نے	ڈالی	ہے ایک اچھتی	نظر
کتنے	جو	گئے	اب	سلسلے	کتنے
کتنے	ہو	چکی	ہے زمین	دل بھی	کتنے
کتنے	اور	آئیں	گے	زراۓ پوچھتے	کتنے
کتنے	یہ	ہیں	یہ	خار	کتنے
کتنے	اوہ	چاہیں	اوہ	آبلے	کتنے

کس سے پچھیں شہر میں ساجد پرانا سال اپنا ہمسفر گدا ہونے کو ہے روز ہوتے ہیں حادثے کتنے اور الوداعی جام مانگے سنواراحمد کنڈے

ہر ایک نقش کو انوار کے حوالے کر پھر اپنی آنکھ کو دیوار کے حوالے کر نہیں ہے مالی غنیمت کا مستحق کوئی جو کچھ ملا ہے وہ سردار کے حوالے کر وہی صوب نے فرمان کر دیا جاری عبدالجلیل عباد

اب اپنے سائے کو دیوار کے حوالے کر ملی ہے جس کی محبت نہ رکھ اُسے محروم جو یار کا ہے اُسے یار کے حوالے کر اداۓ خشن پہ ٹھنڈی شار کر خوشبو کمال رنگ کو رخسار کے حوالے کر بتا رہا ہے زمانہ تجھے تری قیمت دلوں کا مال اب بازار کے حوالے کر برائیوں سے منور بچائے رکھ دامن ہوس کو درہم و دینار کے حوالے کر سوہن راہی سالی نومبارک ۲۰۱۳ء

(یہ قلم دوہوں میں ترتیب پائی ہے)

قر قهراتی شمیں تاروں کی ادائی گھپ اندھیرے دل دامن روشنی کی پیاس آنکھوں کے درپیچے ہوچکا یہ سب مرے احساس کے نئے گھروندے میں دل کے آنکن میں یہ کس کی دعا رنگ اور خوشبو اڑائے کن کی آشائیں ہراول بیل بن کر سوچ کے ایوان پر بل کھا رہی ہیں کن دعاؤں کے کبھی قرشے، تناوں کے تختے، میرے آنکن میں سست کر، چاند تاروں کے اجائے بن رہے ہیں یہ محبت اور دعا کا قرضکس طرح مجھ سے اٹارا جائے گا گھنیرے دکھ کے سائے جل رہے ہیں اے کنوں چاہوں کے روشن ہو رہے ہیں کرنے کر ہرا بے رنگ کوشش کا شجر میرے سانسوں میں آشا بہہ رہی ہے

اضافہ اور اس کا استعمال اس طرح کیا کہ آخر وہ زبان کا ہی حصہ بن کر رہ گئے۔ انگریزی زبان کی بھی تاریخ میں بھی یہ بات نمایاں ہے کہ عیسائی مبلغین نے اس کی اشاعت اور ترویج کے لئے بہت کام کیا۔ اس زبان کے بولنے والوں پر سخت سے سخت حالات آئے مگر انہوں نے اسے زندہ رکھا۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کا ذخیرہ اس میں شامل ہوا۔ اردو زبان نے بھی یہ تدریجی دور خوب دیکھا۔ جن پر اکرتوں ذکر اوپر آیا ہے ان کے متعلق یہ بھی یاد رہے۔ بعض ایسی پراکرنسی جو سنسکرت کی طرح ادبی حیثیت اختیار کر جاتیں۔ عوام انکومتروک کر کے پھر آپس میں ملی جلی زبان کو ایک خاص انداز سے پیش کر کے ایک نئی زبان اختیار کر لیتے۔ جس میں وہ اپنا مفہوم آسانی سے ادا کر سکتے تھے۔ اس میں سے ایک ذکر اپ بھرنش کا ہے۔ اہل زبان نے اسے تھارت سے دیکھا اور اسی لئے اس زبان کو بھرنش کا نام دیا گیا یعنی بگڑی ہوئی زبان۔ اب بھرنش کے وجود کے بعد راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کے زیر اثر گجرات، راجپوتانہ، اور دو آب کی بولیاں جب اس سے مل جل گئیں تو اس کو اتنا فروغ ملا کہ ۵۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک دو آب کی شورستی کا پہنچ تمام شامی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی۔ جو موجوہہ اردو یا کھڑی بولی کا سبب تھی۔ پھر مغربی ہندی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے گرد نواح کی اب بھرنش کا نتیجہ تھی۔ کا و جو دہلی جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے پنجاب میں رانج تھی ۱۲۵۰ء میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے عربی و فارسی کے الفاظ ہندوستانی زبانوں میں تمیزی سے بڑھتے گئے۔ امیر خسرو اور خواجہ سعد سلمان (وفات ۱۲۵۰ء) کی شاعری اس بات پر گواہی دیتی ہے۔ قطب الدین ایک نے جب دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو یہاں لا ہوئی کی بجائے دہلوی زبان تھی۔ جو کئی زبانوں سے متاثر ہو کر اپنی ایک انفرادیت مسلمانوں سے قبل راجپوتی عہد میں قائم کر چکی تھی۔ یہی وہ زبان تھی جس کی بنیاد پر اردو کا وجود قائم ہوا۔ جو زیادہ تر اپ بھرنش کا اثر لئے ہوئے تھی۔ پنجاب سے مسلمان فارسی آمیر پنجابی بولتے ہوئے دہلی آئے مگر یہاں برج بھاشا کی نسبت کھڑی بولی اور ہر یانی صوتیات اور صرف و خوکو پنجابی سے ملتا جلتا پایا اور جلد اس کو سیکھ گئے۔ شاہ جہان کے دور میں آگرہ والوں کا اثر ہونے کی وجہ سے لب و لہجہ میں فرق آگیا۔ اور بدلت، لقا، گذٹی کی بجائے بادل، لوتا، اور گاڑی کہنے لگے فوجیوں نے بھی زبان دانی میں بڑا حصہ ڈالا۔ فوج میں اس وقت کڑی بولی کا اثر زیادہ رہا۔ کیونکہ وہ اپنالہ، کرناں، حصار، اور دہلی کے جنوب سے بھرتی ہوتے تھے۔ جہاں وہ جاتے تھے۔ یہ زبان لے جاتے۔ دہلی کی مرکزیت سارے ہندوستان پر چھار ہی تھی۔ اس لئے لوگ اس کی زبان کو بھی اہمیت دینے لگے اور جلد سیکھتے تھے۔ ان تمام ادوار سے گزرتی ہوئی یہ کھڑی بولی جو اردو زبان کی بنیاد تھی، ترقی کرتی رہی اور بابر کے ہندوستان آنے پر یہ ایک زبان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ یہ زبان بابر اور ہمایوں کے دور میں آگے بڑھی۔ مگر اکبر کے دور میں اس کی ترقی کو نقصان ہوا۔ کیونکہ بعض وجوہ کی بنا پر اسکو آگرہ کو

ہو عطا اس پڑ کو کوئی شر دل پہ اک شعلہ گردے نور کا دیکھ لونے منتظر میں کوہ طور کا راکھ ہوں یہ عجیٰ سفلی لذتیں قرب کی مجھ کو عطا ہوں برکتیں واسطے ہے مصطفیٰ ﷺ کے نام کا قائم لے اب ہاتھ مجھ ناکام کا

اُردو زبان کے ادوار اور فضیلت

رانا عبد الرزاق خان لندن

جب ہم علم انسانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیشہ دو یادو سے زیادہ زبانوں کے میں جوں سے ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ اور اختلاط کا یہ سلسلہ صدیوں تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہی نظر یہ اس دور کی عالمگیر زبان اور لینگوچ افران کا میں ثابت ہوتا ہے۔ کہاں سے یہ زبان چلی اور کہاں آ کر ٹھہری۔ یہ زمانے کی ضرورت بھی تھی۔ اور ایک عالمی حیثیت اختیار کر گئی۔ ہماری قومی زبان اردو نے بھی موجودہ دور تک پہنچتے پہنچتے بہت سے ادوار دیکھے۔ ایک خاص خطے میں بولی جانے والی یہ زبان جو اپنے ساتھ کئی زبانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے سفر پر نکلی۔ اردو زبان اس دور کی اہم زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنے اندر فارسی عربی اور ہندی کو سموئے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں آریہ قوم ۱۵۰۰ سو قم پہلے آ کر آباد ہوئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ قوم پھیلی چلے گئی۔ اور اس کی زبان میں بھی فرق آتا گیا۔ اور آخر ان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت آن پڑی جو منظم اور نکسالی حیثیت رکھتی ہو۔ لہذا اس ضرورت کے لئے سنسکرت وجود میں آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان کو بھی عروج ملا۔ اور مگر ساتھ ہی اسے دو اہم نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ الف۔ اس زمانہ میں اتنی ادبیت آگئی کہ عوام نے اسے استعمال کرنا ترک کر دیا۔ اس طرح یہ ایک خاص طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ب۔ یہ کوئم بدھ اور مہا بیرونی والوں نے بھی اس زبان کی بجائے مقامی زبانوں میں مذہب کی ترویج و اشاعت کی۔ نتیجہً عوام میں ان کی مقبولیت زیادہ ہو گئی۔ اب تو سنسکرت ایک خاص طبقہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ عوام نے ہمیشہ ایک مخلوط زبان رکھی۔ جو تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف خطوں میں مقامی زبانوں کے طور پر رانج ہو گئیں۔ اور برابر چلتی رہیں۔ جن کو پراکرت کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ ان پر اکرتوں میں سے ایک ادبی ٹکل پائی تھی۔ جس کا ذکر اشوک کی لاثوں میں یا پھر بدھ یا جین مت والوں کی مذہبی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ مذہب اور انسان کا رشتہ ہمیشہ سے ہی بڑا قریب کا رہا ہے۔ مذہب نے زبانوں کی ترویج میں بہت کردار ادا کیا ہے۔ علماء صوفیاء اور واعظین نے ہر زبان میں نئے الفاظ کا

سرخ رنگ اور آہنگ ہے۔ یوں جو شے یا تجربہ نفس کی سطح پر ذاتی نہیں ہے وہ تخلیق کے مرحلے میں غیر یا موجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور غیر ذاتی کو ذاتی بنانے کی امنگ شعراء کے ہاں اس آہنگ کو صورت بخشتی ہے۔ جسے حرف کہتے ہیں۔ پر یا آہنگ شاعر کے نفس سے ایک خاص بودوباش چاہتا ہے یہ بودوباش دکھوں کے موسم ہیں۔ اس کے لئے موسموں کے لئے دکھوں کی فصلیں کامنی پڑتی ہیں یہ سیلہ عبید اللہ علیم نے سیکھ لیا ہے۔ اسے دیکھ کر عرفی کا خیال آتا ہے عرفی کی شخصیت کو ہمیشہ مسحوریت کے ساتھ دیکھا گیا ہے اور صورتِ رُخْم سے اباۓ نے کا سیلہ سیکھنا پڑتا ہے۔۔ اُسے جوانی میں ہی زہر دے دیا گیا تھا۔ عبید اللہ علیم اردو کا وہ عرفی ہے کہ زہر کھا کر بھی زندہ ہے ویسا ہی طرح دار، ویسا ہی طناد، ویسا ہی شفق نام، اور ویسا ہی انداز پرست۔ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں وہ ایک اسلوب بھی ہے۔ لفظ اس کی وہ معنوٽ ہے جو ایک قرض دار سے سود خواہ قرض دار کی ہوتی ہے وہ الفاظ کا سود خوار ہے وہ لفظ سے ایک کے دو صور کرتا ہے میرے خیال میں شاعری ایک ایسا معاملہ ہے کہ لفظ سے وہ سب کچھ صور کرتا ہے جس سے اس کی جیب خالی ہو جاتی ہے۔ شعر اس کے ہاں ہنر نہیں ہے کہ ہنر ذات کے مساوی نہیں ہوتا۔ بلکہ شعروہ چیز ہے جسے یونانیوں نے فضیلت سے تعبیر کیا ہے۔ اس فضیلت نے نغمگی کا لباس پہننا ہوا ہے۔ نغمگی جو اس کے اشعار کی سب سے بڑی شاخت ہے۔ عبید اللہ علیم کی تمام غزلوں میں گائے جانے کی جو بے پناہ صلاحیت پائی جاتی ہے وہ اس کے ہم عصر شعراء کی کی غزلوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس کا یہ شعر تھا کہ جمال کی انفرادیت پسند روح کا نغمہ ہے جو ذات اور کائنات میں آواز کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ میں نے ہیجان ذات کے ایک خاص سیاق کے کلام میں ابھی عشق کا لفظ استعمال کیا تھا۔ عبید اللہ علیم اپنی نیزاد اور نہاد میں عشق غیر مشروط اور غیر مل عشق کا آدمی ہے۔ اس کے نزدیک عشق اپنی دلیل آپ ہے اس نے مجھے تعلیم دی کہ عشق اختیار کرو واسے سیکھو غرض عبید اللہ علیم میرا معلم عشق بھی تھا۔

تاریخ سکھاتی ہے صرف ان کو جو سیکھنا چاہیں..... فراز حسید خاں

ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا اس سے پہلی رات بھی فرقہ پرست مسلمان مناظروں اور مباحثوں میں مصروف تھے۔ اور ایک دوسرے کو کافر کہنے میں مصروف تھے۔ صحیح جب منگول بغداد میں داخل ہوئے تو انہوں نے نہ شیعہ دیکھانے سئی، نہ اہل حدیث، نہ ختنی نہ مالکی۔ ان کو جو بھی مسلمان ملا اسے بلا تفریق اور بے دریغ قتل کر دیا۔

ایلیں..... اعزاز طفیل خاں

خدانخواستہ کل شام تم تمام پاکستانی یہ الزام بھی میرے سر تھوپ دو کہ ہم تو بس شیطان کے بہلاوے میں آگئے تھے۔ حالانکہ یہ سب کچھ تم اپنی مرضی سے کرو گے۔ لیکن ہو گا میری مرضی کے عین مطابق، مگر خبردار کسی کو بتانا نامت، بس تم نامعلوم ہو اور نامعلوم ہی کو ووٹ دینا کیونکہ کل جب تم مجھ سے جو کام بھی لو گے میں بھی نامعلوم ہی لوگوں سے تمہارے یہ کام کرو اکر دوں گا۔ اور سب کچھ ہماری مرضی سے ہی ہو گا۔ ہاں مگر یاد رکنا

آگے رکھنا پڑا۔ مگر نے جب شاہ جہان نے آگرہ چھوڑا تو دہلی آباد کیا تو دہلوی زبان کو عروج ملا تب یہ شاہجہانی اردو بن گئی۔ اور انگریب کے زمانے میں اسے سب سے زیادہ اہمیت ملی۔ اور اس کا نام اردوئے شاہی ہونے لگا۔ اب مسلمان شعراء مثلاً عبدالرحیم خان خانان نے برج بھاشا کو ترک کر کے اسی اردوئے شاہی کو اپنانا شروع کر دیا۔ یوں شہلی ہند میں اردو کا تیج بویا گیا۔ اور جب محمد تغلق نے دیوگیری شہر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور ہر شخص کو دہلی سے دکن جا کر آباد ہونے کا حکم دیا تو مال و اسباب کے ساتھ یہ زبان بھی وہاں ساتھی گئی۔ دکنی لوگوں نے اسے اس قدر پسند کیا کہ جلد ہی قبول کر لیا۔ اور یوں دکنی اردو کا باب بھل گیا۔ اس زبان میں تحریریں بھی ملے گیں۔ ہر خاص و عام ولی و صوفی نے اس زبان سے کام لینا شروع کر دیا اور خدا نے بھی اسے اپنے فضل سے یوں بخشنا کہ اب اس کا ذکر کا تمام جہانوں میں گونجئے لگا ہے۔ اور اہل اردو پہاڑیک دہلی یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے (ماخوذ)

جون ایلیا عبید اللہ علیم کے ہم عصر بھی تھے اور ہم عمر بھی۔ وہ عبید اللہ علیم کی شاعری سے متعلق فرماتے ہیں۔

Ubaidullah Ulīm ایک سکے بند شاعر تھے۔ شاعری میں عبید اللہ علیم کا ورود ایک فتنے کا غلہور تھا اس کی ذات ایک ماجرا خیز اور پیکار طلب ذات ہے مگر میں اس کی شاعری کا سرچشمہ ہیجان ذات ہے جیسے کائنات کا سرچشمہ ہیجان وجود ہے۔ ہیجان ذات اپنے اندرستہ کا نہیں پھیلنے کا انداز ہے۔ میرا ہی چاہتا ہے کہ ہیجان ذات کے لئے تخلیق اصل ایک اور لفظ ماجرا ناک لفظ یعنی عشق استعمال کروں۔ مگر ہیجان ذات سے جو شاعری صورت پذیر ہوئی ہے وہ ہیجانی نہیں ہے۔ ہیجان دراصل اس کی شاعری کے وجود کی قوت ہے صورت اور معنویت نہیں۔ اس کی شاعری صورت میں رنگ ہے اور معنی میں تلاش رنگ۔ یہ تلاش رنگ وصال میں فراق اور فراق میں وصال کا سفر ہے وہ شاعری نہیں بلکہ شاعر کے اندر کا وہ شاعر بھی ہے جسے شعور کی سب سے بدنام اور سرگرم سچائی کا استعارہ کہا جائے۔ اس کی شاعری شاعری کے علاوہ وہ الہی شیطنت بھی ہے۔ جو بطور ذات سے ماوراء کی طرف ہجوم کرتی ہے اور ایک نئے خیال اور ایک نئے جمال کو اپنی گرفت میں لے کر بطور ذات کی طرف پلٹ آتی ہے۔ اس نے ایک نکتہ دریافت کیا ہے وہ یہ ہے کہ ادب دعویٰ کرتا ہے۔ دلائل پیش نہیں کرتا کہ ادب تخلیق ہے اور تخلیق خدا۔ اور اسرا نیلیوں کے خداوند (یا وہ) نے اپنے لئے جو کہا ہے کہ ”وہ جو ہے سو وہ ہے“، علیم نے بھی اپنے لئے کہا ہے ”جبیسا بھی ہوں میں اپنی صورت پر ہوں علیم“، جیسا بھی ہوں علیم اس سے کہیں بڑی ایک جواب دہی چاہتا ہے۔ انہوں میں جان لیوا تھا تھا ہے۔ یہ ماورائے ذات کو اپنے طور میں اپنے نفس میں خلق کرنا ہے۔ اس کا عشق غیر ذات کو نفس ذات کو دیکھنے کی رُخْم خود رہ امنگ ہے۔ اور اس کی شاعری اس امنگ کا

طرح کی رکھتی ہیں شیر کی اور نظر کی طرح
دیکھتی ہیں ششیروں کی طرح
ہاتھ سے جاتی ہیں کشمیر کی طرح
ٹوٹتی ہے شہرت کی طرح

گلب اور کانٹا

”یہ نیک ہے کہ تم گلب نہیں بن سکتے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ایک کانٹا بن جاؤ۔ ایک راز کی بات ہے کہ جو کانٹا نہیں بننا چاہتا وہ ایک دن گلب ہی بن جاتا ہے۔
جدید محاورے۔ ۱۔ جہاں واپس اور ہاں اندر ہیر۔ ۲۔ چوری کر جھوڑی میں ڈال۔ ۳۔ یہوی
کے آگے میاں کی نہیں چلتی۔ ۴۔ دوسرا ستدانوں میں کری حرام۔ چور پاہی راضی تو کیا
کرے گا قاضی۔ طفوف مزار

استاد شاگرد سے: بتاؤ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کتنی ہے؟۔

شاگرد: جناب حسابی نظر سے تو دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں لیکن فرقی نظر سے دنیا
میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ اسراد: یہ فرقی نظر کیا ہوتی ہے؟۔ شاگرد: جناب ہر فرقے
کے پاس ایک خاص قسم کی عینک ہوتی ہے جسے لگاتے ہی اپنے سواب مسلمان دارہ
اسلام سے باہر نظر آنا شروع ہوجاتے ہیں اس نظر کو فرقی نظر کہتے ہیں۔

تی جزیش کا حال۔ رات انٹر نیٹ نہیں چل رہا تھا۔ تو میں اپنے گھروں کے پاس جا
کر بیٹھ گیا۔..... اچھے لوگ ہیں وہ بھی!۔

ڈاکٹر اپریشن کے بعد، اور طالب امتحان کے بعد ایک ہی بات بولتے ہیں۔ ”کچھ نہیں
کر سکتے بس دعا کریں“، ایک چوٹی سی بچی دو کاندار سے بولی۔ ”جب میں بڑی ہو گی تو مجھ ساتھ شادی کرو گے؟
دو کاندار ہنس کر بولا“ ہاں کرلوں گا، بچی بولی۔ تو کیا آج اپنی ہونے والی یہوی کو ایک
چاکلیٹ بھی نہیں دے سکتے؟۔“

سید احمد دہلوی، مؤلف ہندوستانی ڈکشنری معروف بہ فرنگ آصفیہ

دہلی مرسلا: زکر یا ورک ٹورنٹو کینیڈا

وفات حضرت آیات حضور ملکہ معظمه قصرہ ہند (تعزیت نامہ)

Address of Condolence H.M.

The Queen

Empress of India, 2nd Feb. 1901

ہماری ملکہ معظمه ہائے، ہماری قیصرہ ہائے، ہماری سلطانہ ہائے
ہائے ہماری مادر مہربان قیصرہ ہند ملکہ انگلستان آپ کہاں تھیں آپ کہاں سو گئیں۔ ایک

نامعلوم کو کبھی معلوم مت ہونے دینا ورنہ کوئی بھی نامعلوم تمہارا کام تمام کر دے گا، اور
رہا میرا مسلسلہ تو تم میرے اپنے ہو، کوئی غیر تو ہو نہیں، تم مجھ پر ایمان لائے ہو تو میرا فرض
ہے کہ تمہارے آخری دم تک تمہارا ساتھ دوں اور تم تو جانتے ہو کہ ہستے بستے شہروں میں
بم، دھاکے، آگ کے شعلے، روئی آنکھیں، بلکہ بچے اور سکتی مائیں، بہنیں اور بیٹیوں
سے مجھے سکون ملتا ہے، ہر روز سڑکوں پر شور مچاتی فائر بر گیڈ کاڑیوں اور ایکولینیوں کی
چیخ و پکار کرنی بھلی موسيقی پیدا کرتے ہیں سوچ لوكل زیادہ دور نہیں۔ فقط تمہارا اپنا الیکس۔

ایک ہندو کی سوچ (لحہ فکریہ) بلاں افتخار

میں بھی سود کھاتا ہوں ۔۔۔ تو سود اور سور بھی کھاتا ہے
میں مندر جاتا ہوں ۔۔۔ تو مزاروں پر جاتا ہے
میں پرشاد کھاتا ہوں ۔۔۔ تو لنگر کھاتا ہے
میں ناریل چڑھاتا ہوں ۔۔۔ تو چاریں چڑھاتا ہے
میں آشیرواد لیتا ہوں ۔۔۔ تو مرادیں مانگتا ہے
میں بھی سجدہ کرتا ہوں ۔۔۔ تو بھی سجدہ کرتا ہے
میں ہاتھ جوڑتا ہوں ۔۔۔ تو ماٹھا میکتا ہے
میں بگڑی کا طالب ہوں ۔۔۔ تو بھی اولاد و مال مانگتا ہے
میں گھنٹی بجاتا ہوں ۔۔۔ تو قوالی گاتا ہے
تو پھر تیرے اور میرے بھگوان دو کیوں ہیں؟
تیرے نبی ﷺ تو مسجد جا کر خدا سے مانگتے تھے تو مزار پر جا کر سجدے کرتا ہے؟ اتنا بتا
دے اے نام نہاد مسلم میں اگر کافر ہوں تو ٹوکیا ہے؟ اگر میں مشرک ہوں تو تو بھی
مشرک ہے۔ تم میں کیا اچھائی ہے جو مجھ میں نہیں

بیویاں..... عاصی صحرائی

بیویاں	آتی	ہیں	ہیر	کی	طرح
میٹھی	ہوتی	ہیں	کھیر	کی	طرح
گلتی	ہیں		تصویر	کی	طرح
مشورہ	دیتی	ہیں	وزیر	کی	طرح
پھرتی	ہیں		سفیر	کی	طرح
نمکین	ہوتی	ہیں	پنیر	کی	طرح

چند ماہ بعد

برتاو	کرتی	ہیں	بے	نظر	کی	طرح
چھتی	ہیں		تیر	کی	طرح	
کردیتی	ہیں		فقیر	کی	طرح	

انگلستان سے بات چیت کرنے میں ان کی عزت افزائی فرماتی رہیں۔ ۲۲ مئی ۱۸۱۹ء کی وہ بشہ گھٹری سب کو یاد ہو گی جس میں جنم لینے کے شادیاں کی دھوم پر رہی تھی۔ شاہی محلوں میں بدھائیوں اور مبارکبادیوں کی گہما گہمی ہو رہی تھی ۱۸۲۰ء کی دو طرفہ امگ اور رچاڑ سے بھری ہوئی ساعت کو بھی کوئی بھولا نہ ہو گا جبکہ آپ خرماں خرماں شاداں و فرحان بھولی بھولی دہن بن کر گرجا میں گئی ہوں گی۔ ساتھ ہی وہ زمانہ بھی یاد آ گیا جس وقت کہ آپ نے ۱۸۲۱ء میں رنسالہ پہنچا جس کا غم اخیر دم تی ہدم رہا۔ ۱۸۲۷ء کے قصیری خطاب کی عالمگیر خوشی بھی ابھی تک دلوں سے دور نہ ہوئی ہو رہا۔ رپہلی سنہری ڈائیمنڈ جو بلی بھی دلوں سے محونہ ہوئی ہو گی کہ دفعۃ ۱۹، ۲۰، اور ۲۱ جنوری ۱۹۰۱ء کو وہ چکلتا ہوا اچودھویں رات کا چاند ماند پڑا۔ اور ۲۲ کو سب سے بلند آسمان پر چڑھ گیا۔ آج ۲۲ فروری کو اس کے ہمیشہ کے واسطے غروب ہو جانے کا دن ہے جس کے سبب تمام ہندوستان اور انگلستان وغیرہ میں اندر ہمراچھارہا ہے۔ ماتم کی گھٹا، غم کا بادل چاروں طرف امنڈ امنڈ کر چلا آتا ہے اور ادھر سے ادھر تک آنسوؤں کی جھڑی لگتا جاتا ہے۔

اے آپ کی سیرت و صورت کے بھوکو، آؤ اس ماہ کامل کے اخیر دیدار کو یکھلو۔ پھر یہ موتی مورت کہاں۔ اب اسکی بجائے تمہارا دل داغ جدا تی کی منزل ہو گا۔ اگر تم پاتال میں جا کر بھی ڈھونڈو گے تو اس ڈوبے ہوئے چاند کا پتا نہ پاؤ گے۔ اسی طرح روتے پیٹتے سر پر خاک ڈال کر چلے آؤ گے۔ اے کٹور یا کو گودیوں میں کھلانے والوںے اسکی آغوش محبت میں پلنے والا ج تم کس دل سے نرم نرم اور گرم بستر سے اٹھا کر ٹھنڈی ٹھنڈی زمین اور خاکستر میں سلاتے ہو؟ کیا تمہارا دل ایسے رحمل کے واسطے نہیں کڑھتا۔ ہائے کیا کرو مجبور ہو مخذور ہو بقول شخصے: کیا اس ترے پیار کو امید شفا ہو۔ جس کو کہ اثر ہونے دعا کا نہ دوا کا۔ افسوس صد افسوس وہ اس صورت کدے میں دیکھتے ہی دیکھتے صورتیں کیا کیا نظر سے اپنی پہاں ہو گئیں۔ ہائے آج انگلستانی زمینداروں کے جھونپڑوں میں جا جا کر خبر گیری کرنے والا ان کے گھر کا جلا چاند کہاں چھپ گیا۔ غریب مریضوں کو شفی دے دیکھ اچھا کرنے والا مسیحی کدھر چلا گیا۔ دیہاتیوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھلونے لادینے اور ان کا مان رکھنے والا باب کہاں جا سیا۔ اپنے ہاتھوں کا بنایا ہوا کام مختا جوں پر جاں ثنا کر دینے والا حاتم صفت جنی کس نیند سو رہا ہے کہ جا گئے کا نام ہی نہیں لیتا۔ جس کی مدح سرائی میں ۲۳ برس سے زبان مقال لال تھی۔ اس کا مریشیہ کیوں نہ باعث ملال و ضھمال ہو۔ وہ امور خانہ داری کی ملکہ، وہ ذائق صفات شعواری کی قیصرہ۔ وہ خوش معاملگی کی دیوی۔ وہ دیا اور دھرم کی رانی، وہ عصمت و عفت کی شہزادی وہ صبر و تحمل کی دل دادہ۔ وہ نیک نیت نیک طینت، صاحب اقبال صاحب کمال۔ خداوند کنت خداوند جاہ۔ عزیزیے برایاشنقت سپاہ۔ سینت اسٹی پتی برتا سلطان۔ وہ وفاداری کی جان ہائے آج کیوں بے نام و نشان ہوتی ہے۔ جس کی حکومت کا سورج کبھی نہیں چھپتا۔ آج وہ ہماری نظروں سے چھپی جاتی ہے۔ نہیں نہیں وہ اپنے خاوند حقیقی ستر برس کی عمر میں اس طرف تجہ فرمائی اور گیارہ برس تک ہندوستانی رو سا واردان

ہندوستان اور انگلستان کیا کہ تمام جہاں کو ہمیشہ کیلئے ماتم کدہ بنا گئیں۔ سچ ہے: کیا اعتبار دہر کا عبرت کا جا ہے یہ: عشرت سرا بکھی کبھی ماتم سرا ہے یہ اگر ہم لوگ وباۓ طاعون میں گھر کربے خانماں بکھی بے درماں ہوتے تو آپ ہمارے لئے کاچی پکڑے دل مسوے پھرتی تھیں۔ اور جو ہمارے اوپ بلاۓ قحط نازل ہوتی تو آپ اس خیال سے کہ بھوکوں کی سار بھوکا ہی جانتا ہے کھانا چھوڑ دیتی تھیں۔ دار جینگ میں زرزلہ آیا آپ کا دل درد مند انگلستان میں تھا ہمدردی کیلئے تار باندھ دیا کہ روتوں بلکتوں کو دین دنیا کا سہارا مل گیا۔ اگر شامی سرحد پر لڑائی ہوتی یا ٹرانسوال پر یا چین پر چڑھائی ہوتی اور احیاناً وہاں ذرا سی آپ کی جا شار سپاہ کی انقلی کتنی تو یہاں بیکل ہو کر آپ کا دل کتنا۔ یہیوں سے مل کر آپ روتیں۔ کیونکہ خود بھی چھوٹی سی عمر میں تیکم پلکہ در تیکم ہو گئی تھیں۔

یہاں کیسا تھا آپ سر جوڑتیں، کس لئے کہ عالم شباب میں خود بھی یہو ہو چکی تھیں۔ ادھرامبروں کی پناہ یافت ہزاری باب پ بنی ہوئی تھیں تو ادھر غربیوں کی درد مند پسنهاری ماں سے کم نہ تھیں۔ یہارٹوں کی وارث تھیں۔ مغلسوں کی ضرورتوں کا ذخیرہ، گو آپ کا بڑا مرتبہ اور اعلیٰ پایہ کا تھا مگر رعایا پر یکساں اور برابر ایک ابر رحمت کا سایہ تھا۔ محروسہ ریاستوں اور مقبوضہ ممالک کے دلوں پر آپ کا قبضہ تھا۔ مسکنیوں کو جاڑے میں جزاول، محتاجوں کو گرمی میں مدرس آپ کے تو شہ خانہ سے ملتی تھی۔ اپنی دستکاری ہی سے آپ ان لوگوں کی مدد فرماتی تھیں جنہیں کچھ میسر نہ ہوتا تھا۔ بھوکوں کی بھوک پیاسوں کی پیاس، آپ کی زیارت سے بھرتی اور بچھتی تھی۔ یا آپ ہی کے اخلاق حسن کا سکھ تھا جس نے ہندوستانیوں کے دلوں کو موم بنا کر ان کے منہ پر شکوہ و شکایت کی روشن مہر لگا دی تھی۔ آپ جس طرح رحمتی اور خدا تری کی پوٹ تھیں اسی طرح سخاوت اور عدالت بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ باوجود یہ کہ آپ کے اور ہمارے منہب میں کوہوں کا بل تھا مگر نہیں سب نے آپ کے اور آپ سب مذہبوں کی حامی و مددگار تھیں۔ ہر فرقہ آپ کو اپنا سرتاج، اور آپ کے راج کو دیوی دیوتا کا راج سمجھتا تھا۔ مسلمانوں کے واسطے آپ زبیدہ خاتون اور ہندوؤں کیلئے امن و امان کی قابل پرستش دیوی تھیں۔ اب ایسی رانی مہارانی کہاں جو من مانی مرادیں بر لائے۔ رعیت کے ہر ایک دکھ میں دوڑ کر شریک ہو جائے۔ خدا تعالیٰ نے علوم ادبیہ کا آپ کو معمول بنا یا اور یہاں تک سدھایا تھا کہ جس وقت آپ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئیں اور آپ کے چھوٹ پچاچا جان نے دوز انو جھک کر حسب دستور شاہی آداب جالایا اور عام رعیت کی طرح فرمانبرداری کا سر جھکایا تو آپ کا ایسا دل بھر آیا کہ آپ اسی وقت زار و قطار رو پڑیں۔ اور بیتا بن فرمایا کہ اپنے چاچا میرے آگے اس طرح کیوں جھکتے ہو؟ میں تو تمہاری گودیوں کی کھلائی ہوئی وکٹوریہ بھتی تھی ہوں۔ علوم ادبیہ پر ہی کیا موقف ہے جمنی، فرانسیسی، لاطینی اور اب اخیر وقت میں ہندوستانی زبان آپ کی مادری زبان بن گئی تھی۔ ستر برس کی عمر میں اس طرف تجہ فرمائی اور گیارہ برس تک ہندوستانی رو سا واردان

زبان کے بارہ میں تحقیقات کا سلسلہ بڑھتا گیا اس خیال کو بھی تبدیلیوں کا سامنا کرتا پڑا۔ جن سے نہ صرف اس زبان کے مقام میں تبدیلی آگئی بلکہ عہد اور زمانے میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ اس سے پہلے عام یہی خیال تھا کہ اردو اپنی متكلم شکل میں سلاطینِ مغلیہ کے لشکروں میں پیدا ہوئی۔ اور وہیں پروش پا کر ادھر ادھر پھیل گئی۔ انہی سر پرستیوں اور ادب نوازیوں کی بدولت دلی اردو زبان کا مرکز بنی اور قلعہ مغلی کی پاکیزہ اور شستہ زبان اردوئے مغلی کہا ای۔ اسی خیال کے ساتھ ساتھ دُن کا نظریہ موجود تھا۔ اور ابھی دکن اس بات کے دعوے دار تھے کہ اردو کا مولڈ و منشاء سر زمین دکن ہے۔ یہ خیال اس حد تک تو ضرور صحیح تھا کہ اردو کی سب سے پہلی تصنیف دکن میں ہی سے ہوئی۔ لیکن اس امر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ زبان کے لئے تفصیلی صلاحیت پیدا کرنے سے پہلے اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اور یہ امر ابھی تک پایہ تحقیق کوئی پہنچا تھا۔ دکنی نظریے کے متعلق زیادہ بحث و تحقیق کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ بعض تاریخی واقعات اور خارجی اور درونی شہادتیں اس کے خلاف موجود تھیں۔ لیکن ان تاریخی شواہد کی چھان بین پورے طور پر نہیں ہوئی تھی۔ اور اردو زبان کے ابتدائی نمونے ابھی پرده اخفاہ میں تھے۔ مزید برآں اس نظریے کے علمبردار خود اس بات کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ گویہ اعتراف دبی زبان میں تھا۔ مسٹر اللہ قادری نے ”اردوئے قدیم“ میں دکنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ زبان شمال سے حملہ آوروں کے ساتھ دکن میں آئی پھر ایک اور جگہ تفصیل سے چھپے چھپے یوں کہا کہ: ”مصنفوں نے عدم واقیت کے باعث اردو کی اس سرگذشت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جو دکن سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے اُن کی تصریحات نہایت ناقص اور متناقض ہو گئیں ہیں۔ تاریخ اردو کا یہ تاریک حصہ جو کئی سالوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اگر وشنی میں لا یا جائے اور اس کی زبان پر اردو زبان کی عہد بجهد ترقیات مطالعہ کی جائیں۔ اور اس کے بعد اس کی تاریخ کو سلسلہ وار ترتیب دیا جائے تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ آپ سبنتگین کے زمانے میں اردو زبان کی ابتداء ہوئی۔“ بعد میں آنے والوں نے تو کھلے طور پر تسلیم کر لیا کہ اردو کی داغ بیل سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں پڑی دکن میں اردو کا مصنف کہتا ہے ”گلستان ہند کے شمال چمن میں مغربی دروازے کے باغانوں نے آکر اردو کا بیج بویا۔ گنگا جنما نے آپیاری کر کے چھوٹے سے پودے کو اگایا اسی کے قریب گلزار دکن میں انہی ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔“ ”اردو شہ پارے“ کا مولف مسعود سعد سلیمان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”مسعود نے تین دیوان مرتب کئے تھے ان میں سے ایک ہندی میں تھا۔ امیر خسرو نے نے اپنے دیوان غزہ الکمال کے دیباچہ میں مسعود کے دیوان کے متعلق یہی لکھا ہے۔ مسعود لا ہور کا باشندہ تھا جس وقت مسلمانوں نے دہلی بیج کی وہ بقید حیات تھا۔ اسی طرح اس نے جو کچھ بھی لکھا ہو گا وہ یقیناً اسی زبان کا تھا۔ جو پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ اور وہ زبان بہت مکن ہے کہ اردو کی بالکل ابتدائی صورت ہو۔ ”اردو شہ پارے کے مولف ڈاکٹر سید محمد مجی الدین قادری کا یہ بیان فی الحقیقت

کی دہن بن کر سدھارتی اور ہم سب کو اپنی محبت میں ترپنہا چھوڑے جاتی ہے۔ ماں کا گزرنا جو کچھ مصیبت لاتا ہے اسے کون نہیں جانتا کہ کیا کیا دکھاتا اور کیسا کیسا ستاتا ہے۔ ہائے ہماری مادر مہربان ملکہ انگلستان آپ آج ایسی سکھ نیند سوئی ہیں کہ اپنے پیارے دلارے بچوں کے جگانے سے بھی نہیں اٹھتیں مشہور تو یہ ہے: جہاں میں جن کو حکومت ہے ان کو نیند کہاں: کہ لگنے دیتی نہیں فکر و بندوبست کی آنکھ۔ مگر آپ کی وہ فکر وہ ہمدردی وہ درمددی وہ سوزی کہاں ہے کہ ہم بلکہ ہیں اور آپ پر وہ نہیں کرتیں۔ دیکھو تو آپ کے لاد لے ایڈورڈ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہار ہے ہیں اور کھڑی پچاڑیں کھار ہے ہیں۔ سنو تو آپ کے سب بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں نواسے کنواسیاں کن حسرت بھری نگاہوں سے مایوسانہ و مجبورانہ آپ کے چہرہ مبارک تو تک رہی ہیں۔ آج ہماری مامتا اور ہمارا خیال کہاں گیا۔ اچھی کیا محبت کا بالکل وصال ہو گیا۔ ادھر آپ خاموش ہیں ادھر ہم سب سکتے کے عالم میں مدھوش۔ تن کی خبر ہے نہ بدن کا ہوش۔ جو سر ہے وہاں دوش ہو رہا ہے۔ جو نظارہ ہے ہوش کھو رہا ہے۔ ایک طرف آپ کا انڈیں سکیرٹری زار نزار ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ دوسری طرف اس کی پاکداں میوی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ مگر آپ ایک کی بھی نہیں سنتیں۔ ادھر یہ آپ کے ہندوستانی دونوں خدمتگار حکم سلطانی کا انتظار کر رہے ہیں۔

ادھر آپ کا یہ مریشہ نگار جس کے ایڈریس اور تصنیف کی رسید میں آپ نے زبان فیض بیان سے یہ قابل فخر فقرے لکھا ہے تھے کہ: ما بدولت تمہارے ایڈریس، تمہاری کتابوں، تمہاری اطاعت قلبی، اور انہار و فاداری کی قدر فرماتی ہیں۔ دھاروں رو رہا ہے اور اسی عالم میں یہ چند سطریں اور تاریخ وفات لکھ کر دل کا بخار نکال رہا ہے۔ رہے جہاں میں نہ باقی سفید ایک ورق: جو میرا قصہ غم ہو کتاب میں داخل۔ لمکتم زدہ و پریشاں سید احمد دہلوی مؤلف ہندوستانی ڈکشنری معروف بہ فرہنگ آصفیہ وغیرہ، از دہلی حولی مظفر خاں، ۲۰ فروری ۱۹۱۴ء شنبہ یوم ذی حضور قیصرہ۔

OOOOO

اردو زبان کی ابتدائی صوفی غلام مصطفیٰ نقیم کی نظر میں

رانا عبد الرزاق خاں

آج تک اردو زبان کی ابتدائی متعلق بہت سے نظریے قائم کئے جا چکے ہیں سب سے پرانا اور مشہور ترین خیال اردو کی ولادت کے متعلق وہ ہے جو محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف ”آپ حیات“ میں پیش کیا ہے۔ کہ یہ زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ جو دہلی اور دہلہ کے گرد و نواح کی زبان تھی۔ اور اس میں سب سے پہلے لکھنے والے امیر خسرو تھے۔ جن کی کتاب ”خالق باری“ اردو فارسی لفظ ہے۔ یہ خیال دراصل پورپ کے بعض فاضلوں مثلاً گارسان، داتا سی اور ڈاکٹر سپر گر کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس میں مولانا صہبائی اور دوسرے اردو کے ابتدائی تذکرہ نگار بھی شامل ہیں۔ لیکن جوں جوں اس

زبان وجود میں آئی۔ جوان کے معاشرتی، تجارتی ضروریات کے لئے کافی تھی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جوں جوں مسلمان حملہ آروں اور نوادروں کے قدم پنجاب کی سر زمین سے آگے بڑھتے چلے گئے تو زبان بھی پھیلتی چلی گئی۔ پنجاب سے دہلی اور دہلی سے شاہی ہندوستان کے باقی علاقوں میں پھیلی۔ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے وہ برج بھاشا اور اردو بھی ربط و ضبط ہے کہ یہ کہنا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور اسی کی ایک شاخ ہے اس نظریہ کی تردید ذرا حافظ محمود شیرازی کے الفاظ میں سنیتے: ”جب ہم اردو کے ڈول اس کی وضاحت کی ساخت اور وضع قطع کو دیکھتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ڈھنگ اور ہے۔ برج بھاشا کا ڈھنگ اور ہے دوں کے قواعد و ضوابط و اصول مختلف ہیں۔ اردو برج بھاشا کے مقابلہ میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے ممائش قریبہ رکھتی ہے۔ برج بھاشا سے چند ترمیمیں قبول کر لینا یا الفاظ کا مستعار لے لینا دوسرا بات ہے لیکن جہاں برج بھاشا نے اس سے الفاظ مستعار لئے ہیں وہاں پر اپنا اثر بھی ڈالا ہے اور برج بھاشا پر کیا موقف ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اردو سے پرتو سے خالی نہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگرچہ اردو زبان میں الاقوامی ضروریات کے لئے وجود میں آئی۔ لیکن بہت جلد وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی عام زبان بن گئی اس نے ستیح پار ہو کر مسلمانوں کا دامن پکڑ لیا۔ مسلمان سپاہی اہل عملہ دست کار، پیشہ ور، مزدور، فقیر درویشوں مسافر کا ساتھ دیا۔ دکن و بنگال و گجرات جہاں کہیں وہ گئے یہاں کے ساتھ رہی اور ساتھ ہی بھی۔ ابتداء میں یہ غیر تعلیم یافتہ عوامی طبقے کی زبان تھی آخر اس کی ہر دلعزیزی دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اس پر توجہ دی۔ مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد سب سے موثر حملہ جو دکن پر ہوا دہلی کے علاوہ سلطان علاء الدین خلیجی کے زمانے میں اسکے بیٹھ خزانے نے کیا گویا یہ سمجھنا چاہیے کہ اس زمانے سے اردو کی داغ بیل دکن میں پڑ گئی اس کے تقریباً پون صدی بعد سلطان محمد تغلق نے دلی سے اپنا دارالسلطنت منتقل کرتے ہوئے دولت آباد میں اپنی راجد ہانی قائم کر لی۔ دہلی کی پیشتر آبادی کو نئے دارالسلطنت میں بننے کے شدید احکام جاری ہوئے اسی زبردست خلط ملط کے طفیل اردو دکن کی سر زمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئی۔ اسی زمانے میں اس میں بول چال شروع ہوئی۔ شاہی ہندوستان کے مقابلہ میں دکن کی سر زمین اس زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ اس کی مختلف وجہات تھیں۔ ا۔ ایک تو یہ کہ دکن کے فرمائز واؤں کی محل سراؤں میں ہندو ایساں داخل ہو گئیں۔ جس سے ان کے تعلقات وہاں کے ہندو باشندوں سے زیادہ استوار ہو گئے۔ لازمی امر تھا کہ وہ ایسی زبان کو جو نہ تو جنی ہو اور نہ ہندوستان کی قدیم پراکرت، نسبتاً زیادہ پسند کرتے جو دو قوموں کے میں ملائپ کا ذریعہ تھی۔ اور جس کا اختیار کرنا دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتا تھا۔ ۲۔ دوسری وجہ اس سر زمین میں صوفیاء اور مشائخ کی کثرت تھی۔ جن کا کام اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس تبلیغ و اشاعت کے لئے عوام سے رابطہ و اتحاد قائم کرنا پڑتا ہو گا۔ لازماً ایک ایسی زبان کو ذریعہ

حافظ محمود شیرازی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“ کے رو عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اردو کی ابتداء کا مسئلہ ہمیشہ بحث طلب رہا۔ دلی لکھنؤ، پنجاب و دکن ہمیشہ اس بارے میں اجھتھے رہے۔ یہاں تک کہ حافظ محمود شیرازی کی کتاب ”پنجاب میں اردو“ شائع ہوئی۔ اور اس نے بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ تمام امور پر روشنی ڈالی۔ جوزبان کے مولد و منشا کے متعلق برسوں سے متنازعہ فیرہ ہے تھے۔ ان تمام تفاصیل کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاہی اور معاشرتی ماحول اور زبان کی ساخت اور اس کے صرفی و نحوی قاعدے اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ موجودہ اردو زبان کو پنجاب کی زبان سے ایک گونہ ممائش ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے پر ”دکن سکول“ اور ”برج بھاشا سکول“ کے پرستاروں میں ایک کھلبلی بھی گئی۔ ہر طرف سے مخالفت کی آوازیں بلند ہوئیں۔ لیکن جب لوگوں نے تاریخی شوہد کو ٹوٹا اور ان کے پیش کردہ دلائل پر غور کیا تو رفتہ رفتہ طبائع کا میلان اس خیال کی طرف ہوتا گیا بالآخر اس نظریہ کی تائید کی۔ اس نظریے کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے شاہی ہند میں مسلمانوں کی آمد، ان کی عسکری کارگزاریوں، اور فتوحات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگرچہ ابتداء میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا اور اپنے مختصر زمانہ حکومت میں اس ملک کی اقوام سے انتظامی میل جوں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ اس سے پیشتر بھی مسلمانوں، اور پنجابیوں اور سندھیوں میں تمدنی میل جوں شروع ہو چکا تھا۔ تاہم سب سے بڑا سیاسی انقلاب محمود غزنوی کے حملوں نے کیا۔ جس کے معروف سترہ حملوں نے نسل انسانی کے دو مختلف گروہوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ بقول مورخ فرشتہ ”غزنی گویا ہندوستان کا ایک صوبہ معلوم ہونے لگا“، ”مودود غزنوی کی سلطنت اس کے بعد کم و بیش ایک صدی تک رہی۔ اس زمانے میں دارالسلطنت غزنی میں ایک ترجمان، ہندوستانی باہمی اظہار و خیال کے لئے رکھا جاتا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک ہندی کے اس ہنگامہ خیز خلط ملط کا نتیجہ کچھ نہ لکھا ہو گا؟ اور اس کا اثر اس زمین پر نہ پڑا ہو گا؟ جہاں سب سے پہلے یہ دونوں قومیں آپس میں نکل رکیں پھر سیاسی حالات اور تمدنی حالات بدل جانے سے ایک دوسرے کے قریب تر آئیں۔ مسعود سعد سلیمان اس دور کا شاعر تھا اس نے اپنا ہندی دیوان جس زبان میں لکھا ہو گا وہ سوائے پنجاب کی زبان کے اور کوئی زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسعود نے خاص پنجابی طرزیں بھی اختیار کیں۔ چنانچہ اس کے فارسی کلام میں بھی ”بارہ ما سہ“ جو ایک خاص پنجابی چیز ہے اور جس کا رواج پنجابی شاعروں میں کچھ عرصہ تک یہاں عام پایا جاتا تھا اس ربط و نظم اور خلط ملط کا نتیجہ تھا کہ حکیم سنائی کے کلام میں بھی جو اسی عہد کے شاعر ہیں۔ بعض ہندوستانی الفاظ ”کوتوال“، ”پانی“، وغیرہ ملته ہیں کوتوال کا لفظ کوٹ والا کی تبدیل شدہ صورت ہے جس کے معنی ما لک قلعہ کے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اس زمانے میں اس زمانے میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں فارسی، ترکی و پنجابی کے باہمی میل جوں سے اس ملک کے باشندوں اور مسلمان آباد کاروں کے درمیان ذریعہ اظہار خیال کے لئے ایک

افواج کے ساتھ جو نکسال قائم کی جاتی تھی۔ وہاں سے نکلے ہوئے سکوں پر ”اردوے“ ظفر قرین“، لکھا جاتا تھا۔ محمد شاہ کے عهد کے قریب شاہی قلعہ کے باہر لا ہوری دروازے کے پاس ایک بازار ”اردو بازار“ کے نام سے مشہور تھا۔ جو غدر کے بعد انگریزی فتح افواج کے ہاتھوں بڑا ہو گیا جس کا ذکر غالب نے بھی اپنے خطوط میں کیا ہے۔ اس طرح اس جگہ کے قریب ایک مندر ”اردو مندر“ کے نام سے آباد تھا جو غالباً لشکریوں کے ہندو عصر کے لئے عبادت گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ غرضیک لفظ اردو کا استعمال ان چار پانچ مقامات پر ہمیں یہ پتہ دیتا ہے کہ ہماری زبان بھی انہی لشکریوں سے منابعست رکھنے کے باعث اس نام سے مشہور ہو گئی اس خیال نے بعض لوگوں کو غلطی میں بہتلا کر دیا ہے کہ زبان اردو اپنی لشکریوں کے اندر پیدا ہوئی اور اس کی عمر خواہ کتنی ہی ہو خود زبان کی موجودگی سے اس سے سینکڑوں سال پہلے سے ثابت شدہ ہے کہ ہمارے لئے پچھلے میں سب سے پہلے اردو کا لفظ استعمال کیا وہ محمد حسین تھیں ہے۔ جنہوں نے اپنی کتاب ”نو طرز مرصن“ آج سے ایک صدی پہلے لکھی تھی۔ پھر اس کے بعد تقریباً اسی زمانے میں میر امن نے ”باغ و بہار“ میں یہی نام استعمال کیا۔ اس کے بعد اس نام کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ آج اس سے بہتر کوئی اور نام معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اردو کا موجودہ نام ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانا ہے۔ خود تھیں اور میر امن اردو نظم کے لئے ریختہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ریختہ کی کئی ایک تشریحات موجود ہیں مثلاً ریختہ وہ زبان ہے جو اپنی اصیلت سے گرجائے۔ آزاد آپ حیات میں لکھتے ہیں کہ ریختہ کے معنی گردی پڑی پریشان چیز کے ہیں۔ چونکہ اردو میں الفاظ پریشان جمع ہیں اس لئے اسے ریختہ کہا گیا ہے۔ ایک اور اعجم کہتے ہیں پلک (یعنی) کے تھنکی (چونکہ) فیکر وغیرہ کے ہیں۔ جو دیوار کو پختہ کرتا ہے اس لئے بھی شاید اس زبان کا نام ریختہ ہو۔ لیکن سب سے معقول تعریف وہ ہے جو پروفسر شیرانی نے کی ہے۔ ریختہ کم معنی ایجاد کرنا کسی چیز کو قالب میں ڈھالنا اور موزوں کرنا کے آتا ہے۔ آٹھویں صدی میں امیر خسروؒ نے ایرانی اور ہندوستانی موسیقی کے امتزاج سے نئے نئے زبانے کا اعلان کیا۔ جن میں سے ایک کا نام ریختہ رکھا۔ آہستہ آہستہ یہ لفظ موسیقی کے مفہوم سے نکل کر زبان اور پھر زبان کی اصطلاح عام بن گیا۔ خود امیر خسرو کے زمانہ ہی میں ریختہ اس نظم کو کہتے تھے جس میں فارسی اور ہندوستانی الفاظ کی آمیزش ہو اس مفہوم میں ریختہ کے لفظ کا استعمال پچھلی صدی تک ہوتا چلا آیا ہے۔۔۔۔۔ یعنی وہ شاعر انہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی باتیں آمیزش سے ترتیب پا کر پھیل رہی تھی۔ بعد موافق پر اس کا اطلاق نہ رکھ پڑھی ہوا ہے۔ ریختہ کے علاوہ اردو کا ایک نام دہلوی بھی ہے۔ بالکل اسی طرح اہلِ دکن اسے دکنی، اہلِ گجرات اسے گجراتی کہتے رہے۔ یہ نام دہلی سے نکلے ہوئے سپاہیوں کے ساتھ دور در تک پہنچا۔ گجرات کے ایک صوفی شیخ باحسن گجراتی نے ایک نظم لکھی ہے جس کا نام ”صفت دنیا بزان دہلوی“ ہے۔ جو اردو کا پرانا نمونہ ہے یورپ کے جملہ آور اور سیاح اسے (Language of Indians)

اشاعت بنا یا گیا جوان بزرگان اور عوام کے درمیان ایک آسان راستہ کا کام دے سکتی تھی۔ ۳۔ تیسری وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ دکن کے تاجدار مغلیہ شہنشاہوں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان بھی پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ اور فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو رواج دے کر اپنی تسلیم طبع کا سامان مہیا کرتے ہوں۔ محمد تقیؑ کے آخر زمانہ سلطنت میں دکن نے بغاوت کی۔ حسن کنگو نے یہی سلطنت کی بیداری کی۔ جو تقریباً دو سال تک حکمران رہا۔ اور پھر یہ میوں کی سلطانی میراث پانچ مختلف خاندانوں میں بٹ گئی۔ یہ سلطنتی طاقت اور ممتاز تھیں۔ انہیں کے عہد میں اردو زبان کو ادبیات کا راستہ ملا۔ یہ سارا عرصہ تقریباً سارے تین سو سال کا ہے۔ اس زمانے میں دہلی اور دکن میں کوئی خاص پائیار مستقل تبدیلی، سیاسی تعلق قائم نہ رہا۔ نتیجہ یہ تکلا کہ اردو متعدد امور میں جو بعض صرف وحشی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور بعض حاوروں سے مختلف ہو گئی۔ اہل علم نے اسی امتیاز کو ظاہر کرنے کے لئے ایک کا نام دکنی رکھا اور دوسری کا نام اردو سے متعلق رکھ دیا۔ دکنی زبان تعلقوں کے عہد کی زبان کی مقلدر ہی۔ اور شمالی ہندوستان کی زبان پیرونی اثرات کے ماتحت بدلتی رہی۔ اور فارسی کی آغوش میں رہ کر اس کے بہت قریب ہو گئی۔ بہر حال دکنی شہانی ہندوستان کی اردو لکھنے مختلف کیوں نہ ہو اس کی بنیادی صورت اردو سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ اس میں بہت سے الفاظ پنجابی کے ہیں۔ وہی جو وہی سے پہلے گزر رہے جس کی کتاب ”مشتوی قطب مشتری“ نے ولی اور گنگ آبادی سے اویت کا سہرا چھین لیا۔ دکن کے قدیم اور اول درجے کے ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کتاب کی زبان میں پنجابی الفاظ کثرت سے ملے ہوئے ہیں دچپی کے لئے چند ایک تفصیل حسب ذیل ہے۔

ادھار (سہارا) انب (آم) آپ (آپ) اجوں (بھی) کوہ (کوں) مرتنا (ڈوب مرتنا) دستا (نظر آنا) اس قبیل کے سینکڑوں الفاظ جو اس طرح جواز میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ امیریار کھنے کے قابل ہے کہ وہی کی شاعری کی مختلف اصناف کی بنیاد پڑی۔ اس مثنوی میں نظم کی یکسانیت کو توڑنے کی خاطر غزل کی صنف کو استعمال کیا گیا ہے۔ طرف یہ ہے کہ غزالیں بذات خود قدیم ادبیات اردو کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ جو بعد میں ولی کے یہاں جنے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ بحث ناتمام رہے گی اگر ہم اردو کے مختلف علموں کا ذکر نہ کریں جو وقتاً فوق اس کے لئے استعمال ہوتے رہے۔ یہ بات تجرب سے خالی نہیں کہ آج ہماری زبان جس لفظ کے ساتھ مشہور ہے۔ وہ ایک نیانام ہے اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی بازاریا کیمپ وغیرہ کے ہیں۔ اور یہ لفظ فارسی تصنیفات میں اس زمانے سے چلا آتا ہے جب سے اس زبان پر مغللوں اور ترکوں نے اپنا اثر ڈالا سب سے پہلے جس کتاب میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے ”جہاں کشاںی جوئی“ ہے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے غالباً اس سے پہلے بابر نے اپنی کتاب ”تیک“ میں اسے استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد یہ لفظ عام ہو گیا۔ لیکن اس کے معنی لشکر گاہ اور چھاؤنی کے رہے۔ مغلوں کے زمانے میں چلتی ہوئی

اور پھر ہندوستانی بھی کہتے رہے جو ائمہار ہویں اور بالخصوص انیسویں صدی میں بہت ہمت ہے تو کھلی فضا میں، زہر یا لب کھلوں عام رہا۔ (بیکریہ لفضل ڈیلی ۲۰ دسمبر ۲۰۱۳ء)

تصویر پاکستان۔۔۔ عاصی صحرائی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

تم تو بند گلی کے اندر بیٹھ کر شور مچاتے ہو ساٹھ سال خوب تو نے عیش اڑائی ہے مکاری سے خوب اپنی دکان چکائی ہے گندے کروتوں سے کیا نام کمایا ہے نہ کوئی دین ہے تیرا نہ باپ نہ بھائی ہے کردار تھارا کونی ہے یوں ہی حسینی بنتے ہو خونی کھیل جو کھیلا تو نے شر یزیدی لگتے ہو دین کا چکر دے کرساری قوم لڑائی ہے اپنے لالج کی خاطر اطاعت کی شیطان کی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

جہاد کا نعرہ دے کر، فرگی کا ڈال رکھاتے ہو غصب حقوق کر کے اپنا مال باتے ہو مزدور و کسان، غراء کی محنت دباتے ہو اپنے بُرنس کا سارا نیکس چھپاتے ہو قوم کا مال سب بیرون ملک چھپایا ہے۔ سرے محل، رائے ونڈ کیسے تو نے بنا�ا ہے امریکی ایجنسیا سے سعودی مال، ہضم کیا ملا کا فتوی لیکر جنگ کی افغان کی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

ویسے تو ہم پھول ہیں لیکن کائنات بھی بن سکتے ہیں شیر جیسا دل ہے، ہشتعلہ بھی بن سکتے ہیں یقین محکم، عمل پیغم، اطاعت و خدمت ان پے چل کر مجاهد بھی بن سکتے ہیں اک رسول کے پیچے چل کر منزل کو پانا ہے ہر قسم کا ظلم سہ کر حسینی بھی بن سکتے ہیں اختر ملک علی نے، جیسے محب، چونڈہ جیتا تھا اس کی حفاظت ہر شہری کا سپنا ہے وقت پڑا تو پیش کریں گے وطن کو اپنی جان بھی تم تو بند گلی کے اندر بیٹھ کر شور مچاتے ہو

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اپنی جیسی سے شکل بنا دی اس گلستان کی یہ سرزیں نہیں ہے صرف مسلمان کی یہ دھرتی توجاگیر ہے ہر اچھے انسان کی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اپنی اپنی انا کی خاطر تئے گل کھلائے ہیں اسی لئے تو اب تک وطن پر کالے سائے ہیں سب قواعد اور قانونوں کو تم نے جھٹلایا ہے کبھی اطاعت نہ کی تو نے قائد کے فرمان کی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اس گشن پر اس کا حق ہے جس نے اسے بنایا ہے تم نے تو مظلوموں کا بے جا خون بھایا ہے نعرے لگا کر خوب لوگوں کو پاگل بنایا ہے سیاستدانوں نے آمروں کو ملک پکڑایا ہے پیورو کریٹ، تاجر، سیاستدان، وڈیروں نے لوٹ کر مادر وطن کو کھایا ہے اس دھرتی پر اک ناکارہ بوجھ ہو تم یہ دھرتی توجاگیر ہے ہر اچھے انسان کی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

اس وقت قوم کو تو نے فتووں میں الجھایا تھا مسلم لیگ کو کفر کا گڑھ، قائد کو کافر بنایا تھا وقت آزادی تو نے گاندی رسول بنایا تھا۔ پیل تھارا بھائی، نہرو تھارا تایا تھا اپڑھی چوٹی کا زور لگا کر آزادی کو روکا تھا بادل نخواست آنے والو، کیا تم نے دھوکا تھا پاکستان کا کونہ کونہ یہ سب ہمارا اپنا ہے اس کی حفاظت ہر شہری کا سپنا ہے وقت پڑا تو پیش کریں گے وطن کو اپنی جان بھی

ظالم یہ کسی تصویر بنا دی تو نے پاکستان کی

بڑے بہادر بنتے ہو، کمزوروں کو ستائے ہو

اسلام کے زریں اصول۔۔۔ اے آر راجچوت

مرکزی سیکٹر یہ گھر کی مدد نبھی تک براہ راست پہنچت تھیں۔ تا کہ کسی حاجت مند کو پہنچے میں دشواری نہ ہو۔ آج ریاست کے سربراہ اعلیٰ کی رہائش گاہ میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔

مگر آج لینن اور مارکس کی معاشری حکمت عملیوں کا چرچا ہے۔ شہر ہے ان کی غریب نوازی کا۔ مگر یہ غریب نواز خود تو محلوں میں رہائش پذیر ہے۔ مگر آپ اس بادہ نشین ﷺ کا حال دیکھتے ہے سونے کے پہاڑ پیش کئے گئے مگر اُس نے کہا کہ میں تو ایک دن کا کھانا کھا کر شکر کرتا ہوں اور دوسرے دن بھوکارہ کر صبر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ﷺ کے مکان اور جھونپڑے میں سویاں کا بستر کھو رکھو۔ گلیوں کو ﷺ کا طرزِ زندگی نہایت سادہ تھا۔ بھوک کی وجہ سے بعض اوقات پیٹ پر پتھر بندھے ہوتے تھے۔ لیکن گھر میں نوتواریں لٹک رہی تھیں۔ اسرائیلی وزیر اعظم گولڈمائر نے لکھا ہے کہ جس وقت عرب اسرائیل جنگ ہو رہی تھی اُس وقت مجھے مسلمانوں کے پیغمبر کی زندگی کا وہ پہلو یاد آگیا جب چرا غ میں تیل نہیں تھا لیکن دیوار پر نوتواریں لٹک رہی تھیں۔ دنیا کی تمام بڑی شخصیات کی زندگی کو پڑھ لیں یہ سب سادگی پسند تھے دنیا کے پانچ ارب پتی پر تیش کی بجائے سادہ زندگی گزار رہے ہیں۔ کیسی بجوبہ روزگار بات ہے کہا مریکی بازارِ حص کے سب سے بڑے بر و کرواریں یافت ڈرائیور تک رکھنے کے قائل نہیں۔ لبنانی ارب پتی کارلوں سلیم ہوائی سفر کو پیسے کا ضیاء سمجھتے ہیں۔ چارک فتنہ جیسے امیر کیرا پتی گاڑی میں سفر ہی نہیں کرتے اور یہ سب عام زندگی بس رکرتے ہیں۔ وارین یافت ایک عام اور بوسیدہ سے مکان میں رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک ارب پچاس کروڑ ڈال کے ماک ہیں۔ سویڈن کے ارب پتی اور ایکتا فرم کے ماک انگلی کا مریڈ کہنا ہے ان کی کمپنی کی مصنوعات غریب لوگ خریدتے ہیں۔ اس لئے وہ غربت کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک امریکی ارب پتی چاک دین کہتے ہیں۔ کہ وہ فضول خرچی نہیں کرتے۔ حضرت عثمانؓ امیر تین صحابی تھے انہوں نے جس سادگی سے غرباء کی مدد کرتے ہوئے زنگی گزاری آج دنیا کے پانچ ارب پتی انہی کی سنت پر عمل پیرا ہیں۔ وارین یافت دنیا کا دوسرا امیر تین شخص ہونے کے باوجود ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ بڑا مکان کیوں نہیں لیتے تو اس کا جواب بڑا دلچسپ ہوتا ہے کہ ”کیا دوسرے لوگوں کے پاس چھوٹا مکان بھی نہیں ہے تو پھر میں بڑے مکان کی خواہش کیوں کروں؟۔“) (ماخوذ از الفضل و جنوری

مظاہموں کے نام۔۔۔ سلمان غازی

ظلم کے دور میں کچھ لوگ ہیں کیوں نہیں عتاب اپنی ناکردار گناہ کا جو دیتے ہیں حساب وا کئے بیٹھے ہیں وہ دل کے دریچے کب سے بھول بیٹھے ہیں انہیں قوم کے رہبر جب سے

اسلام کے زریں اصول ایسے ہیں جن پر جو قوم یا ملک عمل کرے گا وہ ترقی کی معراج تک پہنچے گا۔ ایک دفعہ علامہ اقبال مسولیتی سے ملے تو علامہ نے حضور ﷺ کی اس پالیسی کا ذکر کیا کہ شہر کی آبادی میں غیر ضروری اضافے کی بجائے نئے شہر آباد کئے جائیں۔ مسولیتی پر سن کر مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ کہنے لگا ”شہری آبادی کی منصوبہ بنندی کا اس سے بہتر حل دنیا میں موجود نہیں۔“

آج سے چودہ سال پہلے آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ” مدینہ کی گلیاں کشاہد رکھو۔ گلیوں کو گھروں کی وجہ سے نگز نہ کرو ہر گلی اتنی کشاہد ہو کہ دولدے ہوئے اونٹ آسانی سے گز رکسیں۔“ آج دنیا پندرہ سو سال بعد بھی اس حکم پر عمل کر رہی ہے۔ شہروں میں نگ گلیوں کو کشاہد کیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ مدینہ کے بالکل درمیان میں مرکزی مارکیٹ قائم کی جائے اسے ”سوق مدینہ“ کا نام دیا گیا۔ آج کی تہذیب یاب یافہ دنیا کہتی ہے جس شہر کے درمیان مارکیٹ نہ ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ آپ ﷺ نے کہا تھا۔ ” یہ تمہاری مارکیٹ ہے اس میں نیکی نہ لگاؤ۔“ آج دنیا اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ مارکیٹ کو نیکی فری ہونا چاہیئے۔ اب دنیا بھر میں ڈیوٹی فری مارکیٹ کا رجحان فروغ پار ہا ہے۔ آپ ﷺ نے ذخیرہ اندوڑی سے بھی منع فرمایا۔ آج اگر دنیا اس حکم پر عمل کرتی تو خوارک کا عالمی بحران کبھی پیدا نہ ہوتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ سواد اور سے نفع نہیں نقصان ہوتا ہے۔ آج عالمی مالیاتی بحران نے اس کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ ملک کے ارب پتی آج کشکلوں گردائی لئے پھر رہے ہیں۔ صحابہ گرام کو منع کیا کہ درختوں کو نہ کاٹو۔ کوئی علاقہ فتح بھی ہوتا درختوں کو آگ نہ لگاؤ۔ آج ماحولیاتی آلودگی دنیا کا دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔ عالمی درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ گلیشیر پکھل رہے ہیں۔ گری بڑھ رہی ہے۔ یہ سب کچھ درختوں اور جنگلات کی کی کی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ایک شخص نے مدینہ کے بازار میں بھٹھی لگائی۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ کیا تم بازار کو بنڈ کرنا چاہتے ہو؟۔ شہر سے باہر جا کر بناؤ۔ آج دنیا بھر کے اندر سریل زون شہروں سے باہر ہیں۔ حضور ﷺ نے مدینہ سے باہر ”محی النفع“ نامی سیر گاہ بنوائی۔ وہاں پیڑ اور پودے اسقدر لگوائے کہ وہ تفریح گاہ بن گئی۔ حضور ﷺ خود بھی آرام کے لئے وہاں تشریف لے جاتے تھے۔ آج صدیوں بعد ترقی یافتہ شہروں میں پارک قائم کئے جا رہے ہیں۔ شہروں کے لئے ایسی تفریح گاہوں کا ضروری سمجھا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے مختلف قبائل کو جمع کر کے ”بیشاق مدینہ“ تیار کیا۔ ۵۲ دفعات پر یہ مشتمل معاهدہ دراصل مدینہ کی شہری حکومت کا دستور عمل تھا۔ اس معاهدے نے جہاں شہر کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا وہی خانہ جنگیوں کو ختم کر کے مضبوط قوم بنادیا۔ مدینہ میں مسجد نبوی کے صحن میں ہسپتال بنایا گیا۔ تا کہ مریضوں کو جلد اور مفت علاج مہیا ہو۔ آج ترقی یافتہ ممالک میں علاج حکومت کی ذمہ واری سمجھا جاتا ہے۔ مسجد نبوی کو

کوئی مفہوم نہیں زیست کی تحریروں میں آج ہے وقت تمہارا نہیں رہنے کا یہ کل خواب ڈھلتے نہیں ان لوگوں کے تعبیروں میں دل کی آہوں کا بھروسہ نہیں جانتے کب ڈھونڈتے ہیں اندھیروں میں وہ امیدوں کی کرن باب رحمت پہ پہنچ جائیں تو کیا جائیے کب خوف و دہشت سے مگر بڑھتی ہے دل کی دھڑکن آہ مظلوم کا گروں پہ گزر ہو جائے آگئی آنکھیں ابھی پھرائی نہیں ہے دیر افلک پہ یہ آہ رسما ہو جائے خون بہتا ہے جب انسان کی اس بستی میں ظلم بڑھتا ہے تو اس کار گہہ ہستی میں صفحہ وقت کو تاریخ پلٹ دیتی ہے تخت شداد کو لمحوں میں اُٹ دیتی ہے جن کے افکار بر اکیخت ہیں کینے میں مرے اور وہ ہاتھ جو پیوست ہے سینے میں مرے کیا خبر جور و قسم سے ہی قلم ہو جائے گردن جر کسی طرح سے خم ہو جائے تب یہی خاک نشیں کار گہہ ہستی میں این شیطان کی ستائی ہوئی اس بستی میں وقت کی دھوپ میں ذریوں کی طرح چمکے گے ہب تاریک میں گروں پہ کہیں دکھیں گے رحمت اس ڈر کے اندھیرے کو گھٹائے جب تک ٹوڑ حق گفر کی غلت کو مٹائے جب تک پست انسانوں کی کھٹتی ہوئی عظمت کو نہ دیکھے ظلم کی دھوپ میں سایوں کی درازی کو نہ دیکھے ترقی پسند تحریک مصنفوں سے وابستہ چند تخلیق کاروں کا ذکر عاصی صحرائی

۱۔ مخدوم محی الدین: (پیدائش ۲۷ فروری ۱۹۰۸ء وفات ۱۹۶۹ء)

مخدوم محی الدین نے ۱۹۳۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ حیدر آباد کن میں ابھن ترقی پسند مصنفوں کی بنیاد رکھی۔ اسی شہر میں آسودہ خاک ہیں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری میں ترقی پسندانہ شعور کی انقلابی حرارت آتش فشاں پہاڑ سے نکلنے والے لاوے کی مانند ہے۔ جو ظالماں، غیر منصفانہ اور غاصبانہ استھانی نظام کو چشم کرنے کے لئے ہمہ وقت دہک رہا ہے۔ جذبات کا ایک سیلی روایا ہے۔ جو شفاوت آمیز نا انصافیوں کو خوش و خاشاک کی طرح بھالے جانے پر قادر ہے۔

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے جو گا رہی ہے
یاد رکھنا کہ بدلتا ہے زمانہ پل پل

کوئی مفہوم نہیں زیست کی تحریروں میں آج ہے وقت تمہارا نہیں رہنے کا یہ کل خواب ڈھلتے نہیں ان لوگوں کے تعبیروں میں دل کی آہوں کا بھروسہ نہیں جانتے کب ڈھونڈتے ہیں اندھیروں میں وہ امیدوں کی کرن خوف و دہشت سے مگر بڑھتی ہے دل کی دھڑکن آگئی آنکھیں ابھی پھرائی نہیں ہے ان کی منزل کا کوئی عکس نہیں ہے ممکن ان کے پیاروں کے لئے گھر میں کوئی عید نہیں رoshنی ان کے گھروں میں نہیں امید نہیں چند خاموش نگاہیں جو بھکتی ہو گئی ہو گئی یاں و حضرت سے دروبام کو سمجھتی ہو گئی ظلم کی دھوپ میں جلتے ہوئے شوریدہ بدن طیش نرود کو بھڑکاتی وہ تاریخ گھنیں قبر حکام کے معقوب اسیر زندان جن میں ہے صبر کے اظہار کی ٹو، بے پایاں ان کو طاقت کا نش، جور و قسم، جر سہی ظلم ہتھیار اُدھر ہے تو ادھر صبر سہی وہ جلاتے ہیں چن کو تو جلانے دو انہیں بگ جلتے ہیں تو اشجار بھی جل جاتے ہیں نیک جلتے ہیں تو بدکار بھی جل جاتے ہیں جان لو وقت ہمیشہ نہیں رہتا کیساں آہ مظلوم میں بہت کچھ ہوتا ہے پہاں حرمتیں بڑھ کے اندھیروں کو بڑھا دیتی ہیں ظلمتیں بڑھ کے سوریوں کو جگا دیتی ہیں وحشت و ظلم کے انجام سے غافل ہو کر ایک دن ظلم گرانبار سے بوجھل ہو کر جب بھی پکے گا سنان کف قاتل سے لہو کاٹ دے گا وہ ایک ظلم کی شریان گلو جب یہ انصاف کی چوکھت پہ دھائی دے گا خون معمص کا ہر قطرہ گواہی دے گا تھی قاتل تھی شاہد تھی منصف جب ہو قتل انصاف کا چوکھت پہ تمہاری جب ہو یاد رکھنا کہ بدلتا ہے زمانہ پل پل

بھوکے پچوں کو بہلا رہی ہے کارنے علی گڑھ یونیورسٹ سے بی اے کیا۔ ان کی بہن کی شادی عظیم شاعر جاں ثار لاش جلنے کی نو آرہی ہے اختر سے ہوئی۔ اسرار الحق مجاز کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے انقلابی لمحے، سرمایہ دارانہ نظام سے شدید نفرت، فسطائی جبرا و استھصال کے خلاف مزاحمت اور انسانیت کو درپیش مسائل کے بارے میں تحریت فکر کی لکارقابل توجہ ہے:

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی مھل جھٹری
جانے کس کی گود میں آئی یہ موئی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوت سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کرو، اے وحشت دل کیا کروں
بڑھ کے اس اندر سجھا کا سازو سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستان پھونک دوں
ختخت سلطان کیا، میں سارا قصر سلطان پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

۲۔ احسان الحق احسان دانش: (پیدائش ۱۹۱۳ء وفات ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء)

مزدور شاعر کی حیثیت سے احسان دانش:
کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راتے بند ہیں سب کوچھ قاتل کے سوا
باعثِ رنگ ہے تھاروی رہرو عشق
ہم سفر کوئی نہیں دوری منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شہ سے اٹھایا دل کو
لیکن اس شوخ کے ہنگامہ محفل کے سوا
نج منصف ہو جہاں داروں ہو شاہد
بے گناہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستان میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شور سلاسل کے سوا
احسان دانش کو بہت مقبولیت ملی۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں
انہیں ۱۹۷۸ء میں حکومت پاکستان نے تمغۂ امتیاز عطا کیا۔ احسان دانش خود بھی مزدور تھے۔ اس نے ان کی شاعری میں جو مزدوں کے لئے لفظی مرقع ٹکاری کی گئی ہے وہ
ان کے ترقی پسندانہ شعور کی عکاسی کرتی ہے۔ زندگی کی بھول بھیلوں م اور سرابوں میں
حقائق کی جستجو اور راحت کی منزل کی تلاش ایک سکھن مرحلہ ہے۔ احسان دانش نے یہ
سکھن مرحلہ بڑے کرب سے گزارا۔ احسان دانش کی شاعری میں سماجی زندگی کے
مسئل کا حقیقی احساس و ادراک قابل توجہ ہے۔ ایک ہمپتاں کے جزل وارڈ میں بے
بس والا چار غریب مریض جس جان لیوا کرب سے گزرتے ہیں ان کا احوال حدود رجہ

کوہ غم اور گران اور گران سے پہنچو
غم زدہ تیشے کو چکاؤ کہ کچھ رات کے
رات بھر دیدہ نم ناک میں لہراتے رہے
سان کی طرح آپ آتے رہے جاتے رہے

۲۔ فیض احمد فیض: (پیدائش ۱۹۱۳ء وفات ۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

فیض احمد فیض نے پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے لئے بہت سخت جدوجہد کے لئے قید و بند کی صعبویتیں بھی برداشت کیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند اندز گلرائیک توازن اور اعتدال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں کہیں بھی انہا پسندی کا شاہراہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند سوچ اور غزل کی پُرسوز لے اس قدر پہنچا تاثیر لے میں ہم آہنگ ہو گئی ہے کہ قاری کو ایک ماوس فضا محسوس ہوتی ہے۔ اس کی تصانیف نقش فریدادی (۱۹۳۳ء) دستِ صبا (۱۹۵۲ء) زندان نامہ (۱۹۵۶ء)، دستِ تہہ سنگ (۱۹۶۵ء) سروادیء سینا (۱۹۶۱ء)، شام شیر یاراں (۱۹۶۷ء)، مرے دل مرے مسافر (۱۹۸۱ء) نسخہ ہائے وفا (کلیات ۱۹۸۲ء)، قارئین ادب میں بہت مقبول ہوئیں۔ فیض احمد فیض کو حکومت پاکستان کی جانب سے ۱۹۶۰ء میں شانِ امتیاز عطا کیا گیا اس کے علاوہ انہیں نگار ایوارڈ اور لینن امن انعام سے بھی نوازا گیا۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں ترقی پسند اسلوب، سیاسی، سماجی، اور معاشری زندگی کے مسائل کو نہایت درودمندی اور خلوص کے ساتھ پیرایا اظہار عطا کیا گیا ہے:

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فرد سنجالے
اٹھے گا جب جمع سر فروشاں
پڑیں گے داروں کے لائے
کوئی نہ ہوگا کہ بچالے
جزا سزا سب سینیں پہ ہو گی
سینیں عذاب و ٹواب ہوگا
سینیں سے اٹھے گا شورِ محشر
سینیں یہ روزِ حساب ہو گا

۳۔ اسرار الحق مجاز: (پیدائش ۱۹۱۱ء وفات ۵ ستمبر ۱۹۵۵ء)

اسرار الحق مجاز کا تعلق ایک متاز علی گھرانے سے تھا۔ ان کے جدوجہد مضطرب خیر آبادی اپنے عہد کے نامور شاعر تھے۔ روایی بارہ بیکی اتر پردیش سے جنم لینے والے اس تخلیق

لرزہ خیر اور اعصاب ٹکنے ہے۔

۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ معین احسن جذبی کی شاعری کی انفرادیت اور مرگ طلب قتوطیت قاری کو اداس کر جاتی ہے۔ اس کے اسلوب میں زندگی کے بارے میں جو سوچ پائی جاتی ہے اس میں جوش کی کمی ہے اور وہ متفاہنوعیت کی ہے:

جب کشتنی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتنی میں ساحل کی تمنا کون کرے
ہم دہر کے اس وپرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زبان میں کہتے ہیں، آہوں میں اشارا کرتے ہیں
اے موچ تلاطم ان کو بھی دو چار تھیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفان کا نظارا کرتے ہیں

۸۔ شبیر حسن خان جوش ملبح آبادی۔ (پیدائش ۱۹۸۲ء وفات ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء) جوش ملبح آبادی کی شاعری میں پائی جانے والی اناہیت اور انفرادیت کا کرشمہ دامنِ دل کھینچتا ہے۔ وہ ترقی پسندانہ سوچ کو انقلاب کی سمت لے جاتے ہیں۔ ان کے دبکج بچ کی بنا پر انہیں شاعر انقلاب بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں ۲۰۱۳ء میں ہلالِ امتیاز عطا کیا گیا۔ جوش کی تصانیف کی تعداد ۲۸ عدد ہے۔ ان میں شعلہ و شبنم، جزون و حکمت، فکر و نشاط، سنبل و سلاسل، حرف و حکایت، اور سر و دخروش کو بہت پذیرائی ملی۔ جوش کی خودنوشت "یادوں کی برات" ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت اپنے اسلوب، موضوع اور مواد کے لحاظ سے ایک منفرد تجربہ ہے۔ جوش کی شاعری میں حق گوئی اور بے باکی اپنی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے:-

لایا ہوں بزم و رزم کی ارض تفہاد سے
قدم انسان کا راو دہر میں پھرا ہی جاتا ہے
ہوا کیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے بادل چھا ہی جاتا ہے
یہ طبل جنگ و ساز شبستان ترے لئے
چلے کتنا ہی پچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
۹۔ عبدالحی ساحر لدھیانوی۔ (پیدائش ۸ مارچ ۱۹۸۰ء وفات ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء) ساحر لدھیانوی نے اپنی شاعری میں معاشرے کے مفاؤں الحال، پس مندہ اور استھصال کے پاؤں میں پسندے والی، بے بس والا چارانسانیت کے مصائب کو موضوع بنایا ہے۔

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہونگے

دواں میں باسی، خراب پوش، نہ تازہ کھانا، نہ صاف پانی
نہ خون میں زندگی کی گرمی، نہ سانس میں جان فزا روانی
نہ کوئی آثار تن درستی نہ کوئی خدمت گزار اُن کا
وہ نوجوان خود پسند لڑکے، ابھی جو تعلیم پار ہے تھے
غريب فاقہ کشوں کی جانوں کو تجربوں میں گوار ہے تھے

۵۔ علی سردار جعفری:

(پیدائش ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء وفات ۱۹۰۰ء)

علی سردار جعفری نے ۱۹۳۲ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن ۱۹۳۴ء میں ان کے ترقی پسند خیالات کے باعث یونیورسٹی سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی کالج سے گرجیجاہیشن کی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے پوسٹ گرجیجاہیشن کی۔ اور دوسری عالمی جنگ کے دوران جنگ کے خلاف نظمیں لکھنے پر انہیں حکومت نے زندان میں ڈال دیا۔ ترقی پسند تحریک کے ادبی مجلے "نیا ادب" کی ادارت کی ذمہ داریاں انہوں نے (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۹ء) بڑی جوش اسلوبی سے ادا کیں۔ علی سردار جعفری کی شاعری میں زندگی اور سماج کے متعدد اہم مسائل کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندانہ شعور پوری شدت کے ساتھ موجود ہے

۶۔ جاں ثاراختر:

(پیدائش ۱۹۱۳ء وفات ۱۹۷۶ء)

جاں ثاراختر ترقی پسند تحریک کے سرگرم زکن تھے۔ اُن کے والد مفطر خیر آبادی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ بی اے آئزز کے بعد ایم اے کی ڈگری لی ان کی شاعری میں دروغم کی کیفیت قاری کو بہت متاثر کرتی ہے۔

اشعار مرے یوں تو زمانے کے لئے ہیں
کچھ شعر فقط اُن کو سانے کے لئے ہیں
ان ڈھواں دھار اندریوں سے گزرنے کے لئے ہیں
خونِ دل سے کوئی مشعل توجلانی ہوگی
عشق کے رفتہ و سرگشته جنوں کو اے دوست
زندگی کی ادا آج آج سکھانی ہوگی
۷۔ معین احسن جذبی:

(پیدائش ۲۱۔ ۱۹۱۲ء۔ وفات ۱۳ اگسٹ ۲۰۰۵ء)

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۳۰ء میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں "مولانا حاجی حیات اور ادبی خدمات" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر اسی جامعہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے شعری مجموعے "فروزان"؛ "سخن مختصر"؛ اور گداز شب؛ ترقی پسند شعور کے مظہر ہیں۔ ان کی شاعری کے کلیات ساہتیہ اکیڈمی دہلی کے نیزہ اہتمام

لعن بھیجنا اور مظلوم کی حمایت کرنا اپنا شعار بنانا چاہیے۔ انسانیت، وطن اور اہل طین کے ساتھ گھری قلبی وابستگی اور والہانہ محبت ان کے ترقی پسند شعور کا اہم ترین پہلو ہے

۱۱۔ قرۃ العین حیدر: (پیدائش ۲۰ جنوری ۱۹۲۸ء وفات ۱۲ اگست ۲۰۰۷ء)

قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کا اہم پہلو ان کی فنی مہارت، تخلیقی ریاضت اور انسان دوستی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں ہجرت کے موقع پر ٹوٹ جانے والے صد یوں کے رشتے اور ہسایوں سے دائیٰ جدائی کا کرب آن کے افسانوں میں نمایاں ہے۔ قرۃ العین حیدر کو جذبات نگاری میں کمال حاصل ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں تاثیریت کے حوالے سے قرۃ العین حیدر کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کا ناول آگ کا دریا ہجرت کے موضوع پر بہت اہم ہے۔ ترک سکونت اور نقش وطن کے مسائل کو ہجرت تسلیم کرنے میں انہیں تامل ہے۔

۱۲۔ خدیجہ مستور: (پیدائش ۱۱ دسمبر ۱۹۲۵ء وفات ۲۵ جولائی ۱۹۸۲ء)

خدیجہ مستور نے ترقی پسند تحریک سے گھرے اثرات قبول کئے۔ ان کے دو ناول ہیں آنگن، زمین، جوان کے ترقی پسند شعور کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں بوچھاڑ، کھیل اور چندروز اور شامل ہیں۔

۱۳۔ ہاجرہ مسرور: (پیدائش ۷ اکتوبر ۱۹۳۰ء وفات ۲۵ ستمبر ۱۹۱۲ء) ہاجرہ مسرور نے ترقی پسند افسانے کو معیار اور وقار کی رفتت سے آشنا کیا ان کے افسانوی مجموعے چاند کے دوسرا طرف، تیسرا منزل، اندر ہیرے اجائے، چوری چھپے، اور ہائے اللہ قارئین ادب میں بہت مقبول ہوئے۔ ان کے افسانوں کی کلیات ”اب افسانے میرے“، شائع ہو چکی ہے۔ ہاجرہ مسرور کی علمی، ادبی، اور قومی خدمات پر حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۹۵ء میں انہیں حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ ملا۔ (ماخوذ)

معلومات۔

جسم کے لحاظ سے سب سے بڑا اسرچنڈی کا ہوتا ہے۔ غصہ کرتے وقت انسان کے ۲۳۳ عضلات استعمال ہوتے ہیں جوکہ مسکرانے میں صرف ۷۰ عضلات کام آتے ہیں۔ ۳۔ ہمارے جسم میں ۲۰۶ ہڈیاں ہیں۔ ۴۔ ہماری ناک تمام عمر بڑھتی رہتی ہے۔ ۵۔ ران کی ہڈی ہمارے جسم کی سب سے بھاری ہڈی ہوتی ہے۔ ۶۔ ایک تدرست آدمی میں ریڑھ کی ہڈی کا سلسلہ تقریباً دو فٹ تک لمبا ہوتا ہے۔ ۷۔ پلی کی ہڈی کی شکل انگریزی حرف S کی طرح ہوتی ہے۔ ۸۔ تپ دق (T.B) کے جراثی مودودہ میں پائے جاتے ہیں۔ ۹۔ آنکھ انسانی جسم کا سب سے نازک اور مکمل عضو ہے۔ ۱۰۔ انسانی چہرے میں ۲۱ ہڈیاں ہوتی ہیں۔

جب تک بے آرام ہو تم یہ نئے راحت کوش نہ ہوں گے

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی: (پیدائش ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء وفات ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء)

ترقبی پسند تحریک کی خاطر قید و بند کی صعبوتوں برداشت کر کے احمد ندیم قاسمی نے اپنے نظریاتی ادیب ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفوں کے سیکرٹری کے منصب پر فائز رہے اور انہیں ۱۹۵۷ء میں اور ۱۹۷۴ء میں پاندہ سلاسل کیا گیا۔ حکومت پاکستان نے انہیں ۱۹۶۸ء پر ایڈ آف پروفیشنل عطا کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں کٹھن حالات میں حوصلے اور امید کا دامن تھام کرئے منزل روائی دواں رہنے کا عزم ملتا ہے اس تحصیل اور طبقاتی منافرت کے خلاف ان کا لجھہ خلوص اور درمندی کا مظہر ہے۔

جب بھوک سے پھٹ جاتا ہے مفلس کا کلیجہ کہتا ہے ” خدا نے مجھے کیوں دہر میں بھیجا بھولا سا یہ پچھے یہ یہشتوں کا سکھلوانا کیوں اس کے مقدار میں ہے دن رات کا رونا یا بھوک مٹانے کا سمجھا کوئی طریقہ یا چین سے مرنے کا بتا کوئی سیقہ سنتا ہوں افلس کی پُر درد کرائیں احسان کی قدیل سے جلتی ہیں نگاہیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعر اجنب پھولوں سے لہو پکتے دیکھتے ہیں تو شدت کرب سے اُن کی آنکھیں جل اُختی ہیں۔ خاک چاٹ کر بھی نشہ، ہنر میں رہنے والے ان تخلیق کاروں نے ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے پروش لوح قلم کا ساتھ دیا۔ ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں انہیں جدو جہد کی۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں دیہی معاشرت اور سماج میں پائی جانے والی ناصافی کے بارے میں درد مندی، خلوص اور کرب نمایاں ہے۔ انسانیت کا وقار اور سر بلندی انہیں دل و جان سے عزیز ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں چوپال، سناٹا، کپاس کا پھول، آبلے طلوع و غروب، سیلاں و گرداب، آنچل، گھر سے گھر تک، نیلا پتھر، بزم حیات اور آس پاس شامل ہیں۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے رجحان ساز ادبی مجلے ”فتوں“ نے ترقی پسند ادب کے فروع میں اہم کردار کیا۔ ان کی عظیم شخصیت ان کے اسلوب میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے اسلوب میں ندرت، تنوع، جدت، اور تازگی کے عناصر قاری کو مسحور کر دیتے ہیں۔ اتفاقاً وقت کے مطابق انہوں نے جبراہ انداز مسترد کرتے ہوئے حق و صداقت کا علم بلند رکھا۔ لفظ کی حرمت کو انہوں نے ہمیشہ مخوض رکھا۔ قلم کا احترام ہمیشہ ان کا نصب اعین رہا۔ انہوں نے تمام عمر ظلم اور ناصافی کے خلاف جدو جہد کی۔ ان کے اسلوب سے واضح ہوتا ہے کہ ہر زیر کخلیق کا کوئی ظلم پر